مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

نقوشِ سیرت ﷺ

مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام

نقوشِ سیرت ﷺ

جدید ایڈیشن
نئے اضافوں کے ساتھ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام
پوسٹ بکس نمبر 119 ندوۃ العلماء لکھنؤ

جدید ایڈیشن

۱۴۳۱ھ - ۲۰۱۰ء

نام کتاب	:	نقوش سیرت
نام مصنف	:	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صفحات	:	۲۰۸
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
کتابت	:	ظہیر احمد کاکوروی
طباعت	:	کاکوری آفسیٹ پریس، لکھنؤ
قیمت	:	

طابع وناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر:0522-2741539، فیکس نمبر:0522-2740806

فہرست عناوین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین والصّلاۃ والسلام علی سیدالمرسلین وخاتم النبیین سیدنامحمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین وبعد!

سیرت کے مختلف پہلوؤں پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم نے الگ الگ موقعوں پر مختلف النوع مضامین تحریر فرمائے تھے، ''نقوش سیرت'' کے نام سے یہ مجموعۂ مضامین سیرت حیدرآباد کے اشاعتی ادارے مکتبۃ الحسنی سے ربیع الاول ۱۴۲۴ھ میں شائع ہوا، جس پر تعلیم ودعوت سے جڑی شخصیت مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم وبانی دارالعلوم سبیل السلام حیدآباد نے مقدمہ تحریر فرمایا تھا۔(۱)

یہ مجموعۂ مضامین علمی ودینی حلقوں میں مقبول ہوا، اور جلد ہی دوسرے ایڈیشن کے شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی یہ سعادت مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کو

---

(۱) افسوس اب جب کہ یہ کتاب لکھنؤ کے اشاعتی ادارے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے شائع ہورہی ہے تو وہ وفات پاچکے ہیں اللہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

حاصل ہو رہی ہے، اس لئے ایڈیشن میں محترمی جناب پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب سابق پرنسپل اسلامیہ کالج شاہجہاں پور معتمد مالیات ندوۃ العلماء کا کتاب سے متعلق ایک تعارفی مضمون بھی شامل کیا جارہا ہے جو انھوں نے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے تعلق کی بنا پر لکھا تھا، نئے ایڈیشن میں ان اغلاط کی تصحیحات بھی کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جو پچھلے ایڈیشن میں تصحیح سے رہ گئی تھیں اور مضامین کی ترتیب میں بھی ہلکی ترمیم کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان سب لوگوں کو بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے جن کا اس سلسلہ میں تعاون رہا، اور وہ اسے قبول فرمائے، آمین

ناشر

۹ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہ اولیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبی آئے، وہ سب ایک زمانہ، ایک دور، ایک حلقہ اور ایک علاقہ کے لئے آئے، پھر یہ کہ جملہ انبیاء کرام جو تعلیمات لے کر آئے، وہ ایک خاص مدت اور خاص ماحول کے لئے تھیں، جونہی تقاضے بدلے یہ تعلیمات بھی غیر مؤثر ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ان کی پیروی کرنے والے ان کی حفاظت میں ناکام رہے۔ البتہ نبوت کے اس ''ربانی تسلسل'' میں کوئی نبی اپنے زمانہ سے قیامت کے قائم ہونے تک اور دنیا کے ہر گوشے اور ہر خطے کے لئے آیا اور اس کی تعلیمات محدود زمانہ اور مخصوص ماحول کی حد بندیوں سے ماوراء ہیں اور ان تعلیمات کی حفاظت کا مضبوط اور مؤثر نظم کیا گیا، تو وہی ہے جسے لوگ محمد کہتے ہیں۔ درود ہو اُن پر، سلام ہو اُن پر۔

اس پس منظر میں کس قدر حقیقت افروز اور معنی خیز ہے مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا یہ جملہ:

> یہ ''ایک'' اور صرف ایک جو آیا اور آنے کے لئے آیا، وہی اُگنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔'' (النبی الخاتم)

گویا "وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ" کی تشریح اور اس شعر کی تعبیر:

اک نام مصطفیٰ ہے جو بڑھ کر گھٹا نہیں
ورنہ ہر ایک عروج میں پنہاں زوال ہے

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں انسانی اصلاح وہدایت کے جتنے آسمانی اور انبیائی نقوش تھے، وہ سب مٹ گئے یا اُن کے رنگ پھیکے پڑ گئے، سوائے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نقوش کے۔ یہ نقوش ہر دور اور ہر زمانہ میں زندہ وتابندہ رہیں گے۔ اگر ان نقوش کی حیثیت جلتے چراغ کی ہے، تو اس کی لَو کبھی کسی زمانہ میں مدھم نہیں ہوگی، اور اگر اس سورج کی ہے، جس کے بعد دن کی روشنی نمودار ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مولانا گیلانیؒ کی اس بات سے اختلاف کیا جائے کہ "اسی کے اور صرف اسی کے دن کے لئے رات نہیں۔" (النبی الخاتم) اس لئے پورے یقین اور کامل وثوق واعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کی انسانی مسائل کا حل "پیغامِ محمدیؐ" کے سوا کہیں اور تلاش کرنے کا مطلب اپنی سفری صعوبتوں کو مزید بڑھانا اور منزل کے فاصلے میں اضافہ کرنا یا منزل کو گم کرنا ہے۔ کیونکہ "پیغامِ محمدی" کا سرچشمہ خود خالق کائنات کی تعلیمات وہدایات ہیں، جو ہمارا مالک وآقا ہے، اس لئے آج کی مصیبت زدہ اور تشنہ لب انسانیت کو جس "آبِ حیات" کی تلاش ہے، وہ چشمۂ محمدی ﷺ کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اسی لئے رب کائنات نے ارشاد فرمایا ہے:

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ط (آل عمران:۱۰۱)

"اور تم کس طرح کفر کر سکتے ہو، درآنحالیکہ تمہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کے رسول (اپنی زندگی میں اپنے حقیقی وجود کے ساتھ اور بعد وفات اپنے سنن وآثار کے ذریعہ

موجود ہیں)

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ج (الانفال:۲۴)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کو لبیک کہو، جب کہ وہ (یعنی رسول) تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلائیں)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ o (آل عمران:۳۱)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اللہ بڑا بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے)

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ج وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ج (الحشر:۷)

تو رسول جو کچھ تمہیں دیدیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس سے تمہیں روک دیں، رُک جایا کرو)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱)

تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ) کا عمدہ نمونہ موجود ہے۔)

ان آیتوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جن حیثیتوں کو اُجاگر کیا گیا ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی اس کتاب میں آپ کو ان کی تشریح وتوضیح کے حسین جلوے ملیں گے، ابھی آپ نے سورہ احزاب کی جو آیت پڑھی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ''اسوۂ حسنہ'' یا ''عمدہ نمونہ'' کا تذکرہ ہے، اس کے بارے میں کتاب کے مصنف کا دل آویز قلم یوں گہر بار ہوتا ہے:

''تاریخ انسانی کے طویل سلسلے کے مطالعے اور جائزے کے بعد یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہی تمام انسان کے لئے (بلاتخصیص زمان ومکان) اسوۂ حسنہ اور کامل و جامع نمونہ ہے۔ جس کی اتباع وتقلید اور اس سے استفادہ وفیضیابی ہی افراد کی تعمیر سیرت، کردار سازی اور اقوام وملل کی دینی ودینوی صلاح وفلاح کی تنہا ضامن، مسائلِ حیات اور زندگی کی گوناگوں مشکلات کا واحد حل، قیام امن ومساوات کا واحد لائحہ عمل، اخلاقی وروحانی، سیاسی ومعاشرتی، اقتصادی وتمدنی ترقی کا کامیاب ذریعہ ووسیلہ اور مجموعی طور پر بہترین نظام زندگی، کامل دستورِ حیات اور انسانیت کے لئے ''سفینۂ نجات'' ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری انسانیت کے لئے قابلِ تقلید نمونہ بنا کر بھیجا اور سارے انسانوں کو اس بات کی تاکید کی کہ اپنے پروردگار کی رضا حاصل کرنے کے لئے اس کے رحمۃ للعالمین نبیؐ کو اپنی زندگیوں کے لئے نمونہ سمجھیں اور اپنے عمل کو اسی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کے اعمال وافعال کو عقیدۂ توحید کے ساتھ اسی کوشش کی بنیاد پر قبول کرے گا یا رد کرے گا'' (نقوش سیرت)

مصنف اپنے اسی مضمون (اسوۂ رسول ﷺ اور ہمارا فرض) میں آگے لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات والاصفات کو جامع کمالات بنایا، رسالت کے مختلف پہلو، قیادت کے نوع بہ نوع خصائص اور بلند انسانی اخلاق آپ ﷺ کی ذات میں جمع تھے۔ آپ کی شریعت ہمہ

گیر تھی، اور آپ ﷺ سیاسی اور فوجی قیادت کی بھی اعلیٰ صلاحیت کے
حامل تھے، وسیع پیمانہ پر ایک علمی وفکری بیداری آپ ﷺ نے پیدا
کی، انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے نہایت مضبوط بنیادوں پر
آپ ﷺ نے اسلامی زندگی کی تعمیر فرمائی، آپ ﷺ کی ذات سے
انسانی تاریخ کے ایک نہایت زریں وروشن باب کا آغاز ہوا، ایسا باب
جیسا اس سے قبل دیکھنے میں نہ آیا تھا، جہاں دین بھی تھا اور دنیا بھی تھی،
اخلاق بھی تھے اور سیاست بھی تھی، دعوت بھی تھی اور عمل بھی تھا، جہاں
انسانیت کی خدمت بھی تھی اور حق کا دفاع بھی، مسلح جہاد اور نبرد آزمائی
کے طریقے بھی تھے، اور صلح کی زندگی بھی، تاریخ انسانی نے اپنی ذات
والا صفات سے جس دور کا آغاز کیا وہ اس اعتبار سے تاریخ کا بڑا
عظیم الشان دور تھا، کہ یہ انسان کی دینی وفکری قائدانہ زندگی پر محیط
تھا، اور آپ ﷺ کی پاکیزہ شریعت حیاتِ انسانی کے مختلف گوشوں پر
سایہ فگن تھی، اس شریعت میں تمام انسانی طبقات، گروہوں اور عناصر
کو ایک لڑی میں پرو دیا اور ان سب کو ایک جادہ کا مسافر بنا دیا، وہ جادۂ
فضیلت، حق اور خیر کا تھا"۔ (نقوش سیرت)

اللہ تعالیٰ نے اپنے جس رسول ﷺ کی زندگی کو نمونہ کی زندگی بتایا ہے، اس رسول ﷺ کی بارے میں صاحبِ کتاب نے جو تشریح وتوضیح کی ہے، اس کا ایک دلکش مختصر نمونہ آپ نے ملاحظہ کیا۔ پوری کتاب اسی طرح کے نمونے اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ دوران مطالعہ میں نے محسوس کیا کہ مختلف مواقع مختلف مناسبت اور مختلف موضوعات پر لکھے گئے (۲۵) مضامین کا یہ گلدستہ مشامِ جاں کو تازگی بخشنے کے ساتھ قلب ونظر کی تسکین کا باعث ہے۔ اس کتاب میں عصر حاضر کی مریضانہ ذہنیت اور

بیمار فکر و نظر کے لئے شفا کا سامان بھی ہے۔

کتاب کے مصنف صاحبِ نسبت بزرگ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (پیدائش: ۱۹۲۹ء) علمی و قلمی دنیا میں خوب جانے پہچانے ہیں۔ عربی زبان میں ان کی شہرت کمال درجہ کو پہنچی ہوئی ہے۔ مولانا کی متعدد قیمتی کتابیں ایسی ہیں، جنہیں اہل علم نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور شوق کے ہاتھوں لیا ہے۔ مولانا کی تحریر آسان، سہل، شستہ اور شگفتہ ہوتی ہے۔ چونکہ اسلوب نگارش میں بے تکلفی ہے، اس لئے ان کی بات دل سے نکل کر سیدھے دل تک پہنچتی ہے۔ کثیر المطالعہ، جہاں دیدہ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے فیض یافتہ ہیں۔ اس لئے بات میں گہرائی، گیرائی، باخبری، زمانہ شناسی، پختگی، بصیرت اور للّٰہیت ہوتی ہے۔ مولانا کے نام کے ساتھ ''حسنی'' بھی ہے اور بلاشبہ ان کے اس ''حسنی خاندان'' نے نام کی مناسبت سے علم و عمل، اخلاق و اخلاص اور اصابت رائے کی جو روایات قائم کی ہیں، وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہیں۔ مولانا کی طبیعت میں خاندانی انکسار اور شرافت ہے۔ حسن اخلاق متاثر کن ہے۔ مولانا اس وقت ندوۃ العلماء کے ناظم ہیں۔ مگر تعلیمی فراغت کے بعد ۱۹۵۲ء ہی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے وابستہ چلے آرہے ہیں۔ گویا اس عظیم عالمی تعلیمی ادارہ سے وابستگی پر نصف صدی کا عرصہ بیت چکا ہے۔ ہندوستان کی باوقار اور شہرت یافتہ تنظیم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے صدر کے ساتھ ہند و بیرون ہند میں مختلف تعلیمی کمیٹیوں اور اسلامی اداروں کے رکن اور ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کے صدر، دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے صدر، دارعرفات اکیڈمی رائے بریلی کے صدر، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رکن، مولانا آزاد اکیڈمی کے رکن اور ہندوستان سے باہر کی تنظیموں اور اداروں میں سے آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز برطانیہ کے ٹرسٹی، رابطہ

ادب اسلامی عالمی کے نائب صدر اور اس کے شعبۂ برصغیر اور ممالک شرقیہ کے صدر، رابطہ ادب اسلامی مکہ مکرمہ کے رکن تاسیسی ہیں، ان کے علاوہ ملک کے مختلف دینی، اسلامی مدرسوں کے سرپرست ہیں۔

کم وبیش (۷۴) سالہ مولانا محمد رابع ندوی کا تعلق حیدرآباد سے بہت قدیم ہے۔ یہاں آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ان کے خاندان کے بزرگ مولانا حکیم سید عبدالحیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتابوں کو حیدرآباد کے شہرۂ آفاق تصنیفی و تحقیقی ادارہ ''دائرۃ المعارف'' نے شائع کیا ہے۔ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد ہیں جو مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے ذہنی ربط، فکری مناسبت اور روحانی نسبت رکھتے ہیں۔ حیدرآباد میں ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی میموریل سنٹر'' کے نام سے جو ادارہ مولانا علی میاںؒ کی وفات کے بعد قائم ہوا جس کے ایک حصہ میں ''مکتبۃ الحسنی'' ہے اس ربط، مناسبت اور نسبت کا جلی عنوان ہے۔ ''مکتبۃ الحسنی'' اور میموریل سنٹر نے اپنے زیرِ اہتمام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے پہلے حج (۱۹۴۷ء) کے تأثرات و معلومات پر مشتمل بیش بہا کتاب ''اپنے گھر سے بیت اللہ تک'' حج کے مہینوں میں سے پہلے مہینہ شوال (۱۴۲۲ھ) میں شائع کی تھی، اب یہ سنٹر ہادی اعظم، نبی آخرالزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور وفات کے مہینہ (ربیع الاول ۱۴۲۴ھ) میں مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب کی کتاب ''نقوشِ سیرت'' شائع کر رہا ہے۔ ''نقوش سیرت'' کے جمع و ترتیب میں مولانا سید محمود حسن (لکھنؤ) نے قابل قدر کوشش کی ہے۔ مولانا سید بلال عبدالحی (تکیہ کلاں، رائے بریلی) نے اس سلسلہ میں جس طرح کا تعاون کیا ہے وہ بھی لائق ستائش ہے۔ باطنی خوبیوں کے ساتھ دلکش سرورق اور دیدہ زیب طباعت سے آراستہ اس کتاب کی اشاعت میں محترم جناب سید غلام محمد انجینئر (حیدرآباد) اور محترم جناب محمد عبدالرشید (انجینئر مسجد نبویؐ مدینہ منورہ)

نے اپنی خصوصی دلچسپی کا ثبوت دیا ہے۔ بلاشبہ ان کی یہ دلچسپی قابل قدر بھی ہے، لائق رشک بھی ہے اور باعث سعادت بھی...... کاش! موجودہ حالات اور زمانی ضرورت کے پیش نظر ''نقوش سیرت'' (صفحات تقریباً ۲۰۰) کا انگریزی اور ہندی ایڈیشن بھی آجاتا تو بہتر تھا، اس سے افادیت اور نافعیت کا دائرہ اور بڑھ جاتا اور ''پیغام سیرت'' کو عصر حاضر کے تقاضے کے مطابق باخبری اور بصیرت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے میں مدد ملتی۔

جب میں ان سطروں کو ختم کر رہا ہوں، لکھنؤ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع کانپور سے تعلق رکھنے والے فنا نظامی کانپوری ''نقوش سیرت'' کے معنی خیز نام کے پس منظر میں اپنی نعت کا یہ لافانی شعر پیش کر رہے ہیں:

شاید اسی کا نام ہے توہین جستجو
منزل کی ہو تلاش ترے نقش پا کے بعد

ماہر القادری برسوں حیدرآباد میں رہ چکے ہیں۔ ''نقوش سیرت'' کی اشاعت پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے عالم کیف ومستی میں اندر کے پورے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں:

مرے سرکارؐ کے نقشِ قدم شمعِ ہدایت ہیں
یہ وہ منزل ہے جس کو مغفرت کا راستا کہئے

محمد رضوان القاسمی (۱)
دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

۲۶ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
مطابق ۲۹ مئی ۲۰۰۳ء پنجشنبہ

---

(۱) افسوس کہ مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب بانی وناظم دارالسلام، حیدرآباد نے حیدرآباد میں مورخہ ۲۵ شعبان کو انتقال کیا، رحمۃ اللہ تعالیٰ واسعۃ

نقوش سیرت۔ ایک مطالعہ

پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب (سابق پرنسپل اسلامیہ کالج شاہجہانپور)

جناب مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی نئی کتاب ''نقوش سیرت'' میرے پیش نظر ہے، یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں اور اب کتابی شکل میں سامنے آئے ہیں، اپنے احساسات کو لکھتے ہوئے میں اس بات کی کوشش کر رہا ہوں کہ مولانا کی دارالعلوم کی نظامت، پرسنل لا بورڈ کی صدارت اور دوسرے باوقار عہدے میرے ذہن میں نہ آئیں تاکہ مصنف کی عظمت سے متاثر ہو کر غیر شعوری طور پر کوئی ایسی مبالغہ آمیز بات نہ لکھ جاؤں جو میرے لئے بدمذاقی کی بات ہو اور جناب مولانا کے لئے گرانی کی۔

کتاب کے لائق مقدمہ نگار نے اپنے مقدمہ کو ''نگاہ اولیں'' کا نام دیا ہے اور دو شعر کتاب کے نام کی مناسبت سے لکھے ہیں، ایک فنا نظامی کانپوری کا اور دوسرا ماہر القادری کا، یہ دونوں شعر میرے لئے نئے ہیں اور یقیناً اچھے ہیں مگر پرتو انھیں دو اشعار کے ہیں جو مدت سے زبان زد خاص و عام ہیں اور وقت کے گزرنے سے ان کی تازگی اور والہانہ پن میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، میں انھیں لکھ رہا ہوں۔

اردو کا شعر

منزل ملی مراد ملی مدعا ملا
سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقش پا ملا

اور فارسی کا شعر

بہ زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد شد

یہ دونوں شعر اپنے معنوی حسن اور نغمگی سے آج بھی صاحبِ دل حضرات کو وجد میں مبتلا کر دیتے ہیں مگر اس کتاب کے مضامین تصوف اور ماورائیت سے کم تعلق رکھتے ہیں اور زندگی کی حقیقتوں سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح معاملہ کیا اور کرنے کے لئے فرمایا صرف ان کو بیان کرتے ہیں۔ تصوف نہ سہی مگر روحانیت سے پُر ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی کا بیان ہے، اس مبارک زندگی میں کیسا اعتدال اور توازن رہا، انسانیت نوازی اور ساری مخلوق کے لئے نعمت ورحمت ہونے کا ذکر ہے، جس کے لئے اللہ نے ان کو رحمۃ للعالمین فرمایا۔ پھر مولانا نے اپنے سرکار ﷺ کے امتیوں کو بتایا کہ دیکھو محبتِ رسول ﷺ کے تقاضے کیا کیا ہیں صفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کے لئے قابل اتباع نمونہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی تعلق اور کامل پیروی میں ہی تکمیلِ ایمان ہوتی ہے اور یہی تعلق اور پیروی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے گہری محبت پیدا کرتی ہے۔

یہ مضامین اپنی افادیت اور ندرت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ پوری کتاب سادہ عبارت میں ہے اور جو انداز بیان ہے وہ دل میں اک دم گھر کرتا ہے۔ ذکر کس کا ہے۔ اپنے نبی ﷺ کا جو خاتم بھی تھے اور خاتَم بھی اور ذکر کرنے والا وہ اُمتی جو ان کی محبت میں سرشار ہے اور اپنے سارے علم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک پر رکھ رہا ہے، وہ علم جو بے پناہ مطالعہ سے پیدا ہوا ہے، ایسا علم جو صرف علم کتابی

نہیں بلکہ علم نافع ہے۔ کیا عرض کروں ''بنتی نہیں ہے بات بادہ وساغر کہے بغیر'' جو مضامین خود مضمون نگارر کے گدازئ قلب کے آئینہ دار ہیں۔ پوری کتاب میں تعلیمات اور فرمودات کے موتی بکھرے ہوئے ہیں، کیسی سادگی سے ان کا بیان ہے۔ یہ گلشن ہست وعدم اللہ کا بنایا ہوا ہے اس کے باغباں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس کے مصور ہمارے مولانا۔

یہ مضامین ان سے تعلق رکھتے ہیں جو امام انبیاء ہیں سرور کون ومکان ہیں، جو امین اور صادق تھے، جنہوں نے انسان کو مساوات کا تحفہ دیا جو حامل کتاب اور سراپا کتاب تھے، جو بے کسوں کے مربی تھے، بے سہاروں کے کفیل تھے، جن کو ہمیشہ ہماری بہتری کی فکر رہتی تھی جن کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن دل نہیں جن پر راز نہاں ہویدا تھا اور جو اُمی تھے لیکن جن کے لئے حافظ شیرازی نے کہا ہے کہ ؎

نگار من کہ بہ مکتب نہ رفت وخطہ نہ نوشت
بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

اور سعدی کا شعر ذہن میں آتا ہے ؎

یتیمے کہ نا کردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

کیسے صاحب دل شعراء تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتے تھے۔

مولانا کا دل بھی عشق کی جلوہ گاہ ہے، مولانا کی تحریر ایک طرح سے شعور حسن کا اعلان ہے یہ تحریریں خالص واقعات اور حقیقتوں کا بیان ہیں مگر بین السطور میں شاعرانہ ادراک اور صوفیانہ ادراک دونوں ہیں صناعی سے پرہیز نے جاذبیت پیدا کردی ہے کیسا فطری، حسین رفعت بخش اور دیانت دار بیان ہے، دماغ اور دل ہم آہنگ ہیں

جذبہ اور فکر گلے مل رہے ہیں، سحرِ حلال سے ان کی مثال دی جاسکتی ہے یہ طلسم خیالی نہیں، اس کی روح تو مولانا کے ہاتھ میں ہے۔

یہ باتیں جو مولانا نے لکھی ہیں پہلے بھی لوگوں کے علم میں رہی ہیں اور بیان بھی کی گئی ہیں مگر ایسا حسنِ بیان کہاں، یقیناً تحریر کی قدر و قیمت نفسِ مضمون سے ہوتی ہے مگر وہ صداقتیں جو مطلق اور بدیہی ہوں صرف حسن بیان ہی سے انسان کے قلب پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔

آیئے اب کتاب کے مندرجات پر نگاہ ڈالی جائے۔

پہلا مضمون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف ادوار سے تعلق رکھتا ہے، نبوت کی ابتدا، کافر کس طرح آپ کو اور مسلمانوں کو ایذا پہنچاتے تھے، ایسی ایذا رسانی جو موت کا بھی باعث ہو جاتی تھی، کیسے آپ کے رفقاء نے ۱۳ ربرس تک کی مدت، اسلامی دعوت اور ایمانی تربیت کے ساتھ صبر و برداشت میں گزریں۔ طائف کا سفر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمدردی اور حمایت حاصل کرنے کے لئے کیا تھا مگر وہاں عام انسانی اخلاق بھی نہیں ملا بلکہ سخت اذیت پہنچائی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدیت کے اعلیٰ معیار کو ترجیح دی، دعا میں اپنی بے بسی اور ناطاقتی کا اظہار کیا لیکن سزا پر راضی نہیں ہوئے۔ پھر مدینہ منورہ کی ہجرت کا بیان ہے، دشمن اجتماعی طاقت سے حملہ آور ہوتے اور آپ مقابلہ کرتے، یہودی اور منافقین اندرونی طور پر دشمنی کرتے، ان کو بھی جھیلتے پھر بدر کا معرکہ ہوا، غرض ان باتوں کا بیان جن میں حضرتؐ نے مشقتوں سے گزارے گئے، شخصی سانحوں سے بھی گزارے گئے، راحت و مسرت سے بھی گزارے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ساری انسانی برادری کے لئے ایک مثال بنی، کیا اعلیٰ صبر و رضا اور وسیع القلبی کا نمونہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔

پھر ماہ سعادت یعنی ربیع الاول کا بیان آیا، مولانا نے کلام پاک کی آیت لکھی

جس میں عربوں سے خطاب ہے کہ تم ہی میں نبی آیا ہے اور تم ہی میں کا ایک فرد ہے، اس کو تمہارے دکھ درد کی بے حد فکر اور احساس ہے، وہ تمہارا بے حد خیال کرنے والا ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے بے حد شفیق اور رحم دل ہے۔ پھر دوسری آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ کو ہم نے تمام جہانوں کے لئے رحم وکرم بنا کر بھیجا ہے۔ یہ چھوٹا سا مضمون اپنی مثالوں کے لحاظ سے منفرد ہے اور ان آیتوں کی تفسیر ہے جن کا ترجمہ ابھی لکھا گیا ہے، آگے کا مضمون بھی اسی تسلسل میں ہے، ربیع الاول کا اصل پیغام خدائے واحد کی بندگی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری اور محبت ہے، مولانا نے خاص ہجرت کو بطور واقعہ بیان کرنے کے ساتھ بہترین نتائج نکالے ہیں، ہجرت کا عمل بڑا عظیم عمل ہے، یہ وہ عمل ہے جس کا درجہ جہاد کے علاوہ ہر عمل سے بڑھ جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی پر مضمون کتاب کی جان ہے، یہ مضمون نسبتاً طویل ہے اور بے حد اثر ڈالنے والا ہے، آپ ﷺ نے ساری راحت وآرام حاصل ہونے کے باوجود غریب اور سادہ طرز زندگی اختیار کی۔

رفقاء کے لئے ایک نہایت ہمدرد اور انس ومحبت رکھنے والے سرپرست تھے، بچوں اور بوڑھوں کا بے حد خیال رکھنے والے، اس خیال رکھنے میں ان کی مزید دل جوئی کے لئے ہلکا سا مزاح بھی کبھی کبھی کر لیتے تھے جیسے ابوعمیر کی چڑیا کی پرسش، بوڑھی عورت سے بتانا کہ بوڑھے جنت میں نہیں جائیں گے اور پھر اس کی وضاحت۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جوانی کے بہترین حصہ کو ایک ایسی بیوی کے ساتھ گزار جوان سے عمر میں بڑی تھیں، انتقال کے بعد ہمیشہ محبت سے یاد کیا۔ آپ ﷺ نے ازواج مطہرات میں اپنے معزز خاندان اور دیگر خاندانوں کی خواتین کو شامل کیا، نومسلم خاتون، باندی بن کر آنے والی خاتون کو آزاد کر کے رشتۂ زوجیت میں لیا، یہ

شادیاں تعلق والوں کی دلداری کے لئے تھیں، غلط رواج کو باطل کرنے کے لئے بھی تھیں، سب کے ساتھ انصاف اور برابری کا برتاؤ کیا اور اپنی پسند کو ترجیح نہیں بنایا۔ بچوں کو پیار کرتے تھے۔ کبھی اپنی ذات کے لئے کسی پر غصہ نہیں کرتے تھے۔ صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا انتہائی چہیتی تھیں مگر ان کے لئے مال ودولت کیا ایک خادمہ کا بھی انتظام نہیں کیا غرض پورا مضمون ایک ایسے نبی کے ذکر پر ہے جو رحمت ہی رحمت تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندگی میں اعتدال اور توازن کو بہت عزیز رکھتے تھے، بطور نصیحت خود اپنی ذات مبارک کے لئے فرمایا میں تم میں سب سے زیادہ متقی اور اللہ سے ڈرنے والا ہوں، رات کو عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں روزہ رکھتا ہوں اور روزے سے خالی دن بھی چھوڑتا ہوں، شادی بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقہ پر نہیں ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امتیوں کو تعلیم دی مگر آپ ﷺ عبادت گزار اور شب زندہ دار ایسے تھے کہ پیروں میں ورم آجاتا، روزے اتنے رکھتے کہ شعبان کا مہینہ بھی اکثر وبیشتر روزوں میں گزر جاتا مولانا نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان کیا ہوا دودھ کا واقعہ لکھا کہ کیسے تھوڑے سے دودھ نے بہت سے لوگوں کا پیٹ بھرا۔ یہ تو خیر ایک معجزاتی کیفیت تھی مگر یہ واقعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کی کتنی کمی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کہ دوسروں کی بھوک کو اپنی بھوک پر ترجیح دی۔ آپ ﷺ نے اعلان فرمایا تھا کہ کوئی مسلمان اگر انتقال کر جائے تو اس کا چھوڑا ہوا مال اس کے ورثاء کا اور جو قرض وہ چھوڑ گیا اس کی ادائیگی میرے ذمہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری انسانیت کو یہ پیام دیا کہ اپنی دنیاوی ضرورت کو اللہ کے حکم کے مطابق اور رضائے الٰہی کی نیت سے پورا کیا جائے تو ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسے کسی مذہبی کے عمل سے ملتا ہے۔

مصنف کتاب کا سب سے پسندیدہ موضوع یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ساری انسانیت کے لئے نعمت ورحمت ہے۔ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرنے والے تو سب ہی مسلمان ہیں اور واقعی ان کا دعوی صحیح ہے مگر محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضے کیا ہیں، وہ جو کام، احکام اور شریعت لائے اس کا ماننا اور اس کے حکموں پر چلنا، اسلام نے حق کا راستہ یہی متعین کیا ہے۔ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے لئے فرمایا کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے اور یہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور آخرت کے دن کی جواب دہی کا خیال رکھتا ہو اور اس نے اللہ کو یاد کیا ہو۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا ایمان اس وقت تک درست نہیں جب تک تم مجھ کو اس سے زیادہ محبوب نہ بناؤ جتنا تم کو اپنے باپ اپنی اولاد اور دنیا کے سب محبوب لوگ ہو سکتے ہیں۔

کیسا ہی سخت امتحان ہو طاعت اور محبت میں فرق نہیں آتا تھا، اس ضمن میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ بڑا عبرت آموز ہے۔

مضامین کا یہ سلسلہ جاری اور ساری ہے اب موضوعات میں صفات نبوی ہر مسلمان کے لئے قابل اتباع نمونہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی تعلق اور ان کا اتباع کامل، امت کی رہنمائی اور لوگوں کے ساتھ سلوک میں ذوق ومزاج کی رعایت اور کلام میں ادبی حسن کا لحاظ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ دعوت وتبلیغ اور عصری تحریکات، سیرت نبویؐ میں دعوت اور سیاست کا امتزاج اور اس میں ہمارے لئے رہنمائی، عہد حاضر میں تعلیمات نبویؐ کی ضرورت، معاشرہ کی اصلاح میں حدیث و سنت سے رہنمائی، سیرت اور اخلاق کی تعمیر میں حدیث کا کردار سیرت نبویؐ اور ادب، کلام رسول ﷺ ادبی بلاغت کا شاہکار، مولانا نے بہترین نکات پیش کئے ہیں۔

میرا یہ مضمون عام ڈگر سے ہٹا ہوا ہے۔ اپنی طرف سے باتیں کم کہی ہیں اور

کتاب کے اقتباسات زیادہ لئے ہیں مگر ''یہ زیادہ'' بھی ایسا ہے جیسے غلہ کے ڈھیر سے ایک مٹھی غلہ نکال لیا۔ مگر یہ ایک مٹھی غلہ پورے ڈھیر کی کوالٹی (Quality) کو بتا دیتا ہے، کتاب کا وصف تو کتاب پڑھنے میں ہے جیسے مٹھائی کے ذائقہ کا لطف اس کے کھانے میں ہے، بتانے میں نہیں، یہ کتاب تو پورے طور پر ذکر حبیب ﷺ میں ہے، یقیناً میں کتاب کا حق ادا نہیں کر سکا ہوں مگر یہ دامان نگہ کی تنگی ہے ورنہ خوبصورتی کے یہ پھول تو بے شمار ہیں ۔ اب آخری مضمون کا ذکر آتا ہے وہ حمد و مناجات کی ادبیت مولانا نے سرکار دو عالم ﷺ کی دعاؤں اور مناجاتوں کے نمونے پیش کئے ہیں ۔ اس کا تفصیلی بیان تو مضمون کو بہت طویل کر دے گا مگر یہ مضمون اس گلدستہ کا سب سے خوبصورت پھول ہے۔

پوری کتاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اور پاکیزہ زندگی ، رواداری ، برداشت ، ثابت قدمی ، بہادری اور رقیق القلبی کے ذکر سے مملو ہے ۔ اسوۂ حسنہ کی بہترین وضاحت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گدازیٔ قلب اور رقت مزاج کی بے شمار مثالوں میں چند مولانا نے بیان کی ہیں جو دل کو چھو لیتی ہیں ۔ اپنے چھوٹے نواسے کو جو جانکی کے عالم میں تھا اپنی گود میں لیتے ہیں اور آنکھ میں آنسو بھر آتے ہیں ۔ ایک صحابی نے کہا کہ آپ بھی ایسے متاثر ہوتے ہیں ۔ فرمایا میں انسان ہوں ۔ میرے دل میں بھی محبت ہے اور اتنا بھی نہ ہو تو انسان کیا ۔ اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکلوتے بیٹے کا انتقال ہوا تو فرمایا میری آنکھیں نم ہو رہی ہیں ۔ دل غمزدہ ہے لیکن میں اپنے زبان سے صرف وہ کہوں گا جس سے میرا رب راضی ہو ۔ اے ابراہیم تمھاری جدائی ہم پر غمزدہ ہیں۔

مولانا کے مضامین کا سلسلہ سلسلتہ الذہب ہے بلکہ زیادہ خوبصورت مثال

یہ ہوگی کہ موتیوں کی لڑی ہے۔ سب الگ الگ ہیں مگر ایک ربط باہمی سے بندھے ہوئے ہیں مولانا اپنے محبوب موضوع کو دہراتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تکمیل ایمان کے لئے لازمی ہے۔ یہ ایک طرح سے احسان شناسی اور شکر گزاری بھی ہے جو اعلیٰ ترین انسانی جذبے ہیں۔ اللہ نے وہ رسول ہمارے پاس بھیجا جس کو ہماری تکلیف اور پریشانی گوارہ نہیں۔ وہ ہمارا بہت دھیان رکھنے والا ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں اس آیت کا ترجمہ لکھ رہا ہوں، جو دین کی تکمیل کا اعلان ہے۔ ''آج یعنی اب میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو تمہارے لئے بحیثیت دین پسند کیا''۔

یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ اس کتاب کے مضامین مسلسل طور پر جاذب توجہ ہیں۔ ایک حصہ سے جو لطف ملتا ہے وہ مجموعی طور پر ملتا ہے۔ مصنف کا نام اگر کتاب پر نہ لکھا ہوتا تو وہ بھی مخصوص لب ولہجہ، عبارت کا انداز تاثیر اور آہنگ سے اچھے مطالعہ والے فوراً پہچان لیتے کہ نغمہ سرا کون ہے اور اس نے یہ نغمے کس لئے گائے ہیں۔ مصنف کی روح میں ہمہ گیری اور وسعت ہے اور عام آدمی سے زیادہ انسانی فطرت کا علم رکھتے ہیں۔ کیسی باکمال اور معتبر شخصیت لکھنے والے کی ہے۔ یقیناً انھوں نے جو شہرت پائی ہے وہ اس کے پورے طور پر مستحق ہیں۔ وہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی یادگار ہیں اور جو قدر و قیمت حضرت مولانا کی اپنی زندگی میں ہوئی وہی مولانا محمد رابع ندوی کی بھی ہوئی ہے۔ یہ ایک بہت خوشگوار تعجب کی بات ہے ورنہ ہماری قوم کے افراد اپنی ساری عقیدت کا اظہار علم وفضل کو خراج اپنے ممدوح کے نہ ہونے کے بعد ادا کرتے ہیں۔

مضمون کے اختتام پر اللہ تعالیٰ سے مولانا کی صحت وسلامتی اور درازی عمر کی دعا کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ ابر گہر بار ایسا ہی برستا رہے اور علم کے موتی ہماری جھولی میں پڑتے رہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمدلله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد وآله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين۔أما بعد

حضرت سیدنا ومقتدانا ومحبوبنا ومحبوب رب العالمین محمد بن عبداللہ الامین فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی آخری امت کا رسول بنایا اور اپنے دین کو ان پر نازل کی جانے والی وحی پر مکمل فرمایا، اور نبوت کا سلسلہ جو انسانوں کے مورث اعلیٰ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے چلا آ رہا تھا، اس کو ختم فرمایا، آپ ﷺ کی امت کو کامل معیاری اور دوسری امتوں کا نگراں امت بنایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ایک مکمل انسان بنایا اور مخلوق انسانی کے اندر پیدا کی گئی اعلیٰ صلاحیتوں کا حصۂ وافر معیار اعلیٰ کے مطابق اللہ تعالیٰ جو اپنے نبیوں میں رکھتا رہا ہے، ان کو مزید اعلیٰ و جامع معیار پر اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں رکھا، اور آپ کو آخری نبی اور نبیوں کا سردار بنایا اور آپ ﷺ کی امت کو حکم دیا کہ صفات اور خصوصیات کو اپنے پیشِ نظر رکھو، اور ان میں سے جتنی اپنی زندگی میں لانے کی کوشش کر سکو کوشش کرو، تاکہ تم صرف انسانی مخلوق ہی نہ ہو، بلکہ انسانی خصوصیات وکمالات کے اچھے معیار کے مطابق انسان بنو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں آپ ﷺ کے بارے میں اس کا اظہار فرمایا کہ اللہ کے نبی فرشتہ نہیں ہیں، ایک انسان ہیں، وہ خالق اور رب نہیں ہیں، بلکہ اپنے خالق اور رب واحد کے بندے ہیں، البتہ انسانوں میں وہ ممتاز ترین انسان اور اپنے رب اور اپنے ہم جنس مخلوق کے درمیان ربط و تعلق کا ذریعہ اور پیغام رساں ہیں، آپ ﷺ بشر ہیں، نبی ہیں اور رسول ہیں۔ بشر یعنی انسان، نبی یعنی آخرت کی باتیں بتانے والا، رسول یعنی اللہ کا پیغام پہنچانے والا، پھر آپ ﷺ کو آخری نبی بنا کر سب پر فوقیت دی، اور آپ ﷺ کی نبوت کا زمانہ قیامت تک پھیلا دیا، یعنی قیامت تک آنے والے سب آپ ﷺ کی نبوت کے سایہ میں اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے حکموں کے پابند ہوں گے اور آپ ﷺ کی محبت اور اتباع کو سارے انسانوں کے لئے لازمی اور نجات کا ذریعہ بنایا اب انسانوں کے لئے آپ ﷺ کی پیروی کے کوئی چارہ نہیں، اور آخرت میں کامیابی کے لئے کوئی سہارا نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ انسانی زندگی کے متنوع حالات کا ایک طرح سے مرقع ہے، اس میں ہر انسان اپنے مسائل اور انسانی تقاضوں کے لئے قابل تقلید نمونہ دیکھ سکتا ہے، اور اس کے مطابق اپنی زندگی کے مسائل کا حل حاصل کر سکتا ہے، اور یہ آپ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق عمل کرنے پر ہی ہو سکتا ہے، جس میں بنیادی طور پر خدائے واحد پر ایمان، آخرت کی جزا و سزا پر یقین، اللہ کی مخلوق ملائکہ، اور اس کے سارے انبیاء کے اوپر ایمان اور پھر آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباع لازم ہے، اور آپ ﷺ کی تعلیمات آپ ﷺ کے اقوال اور آپ کے اعمال دونوں میں پھیلی ہوئی ہیں، جن کے لئے آپ ﷺ کے ارشادات سے واقفیت اور آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

مختلف موقعوں پر مختلف دوستوں کے تقاضوں پر مجھ کو سیرت کے سلسلہ میں

اپنے حسب توفیق مطالعہ کی جھلکیاں پیش کرنے کا موقع ملا، جو لکھنؤ مسلم ایسوسی ایشن (لکھنؤ) کے سالانہ مجلّوں میں اور ندوۃ العلماء کے مجلّہ تعمیر حیات کے متعدد شماروں اور مختلف سیمناروں اور اجتماعات میں مقالوں کی صورت میں پیش کرنا ہوا ان کی تعداد ایسی ہوگئی کہ ایک معتدل ضخامت کی کتاب بن سکتی ہے، میرے بعض مخلص دوستوں نے ان کے جمع کرنے کی رائے دی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ مختلف النوع مقالات اس اہمیت کے ہوں گے کہ ان کو مجموعہ کی شکل میں پیش کیا جاسکے۔ لیکن موضوع کی بلندی اور برکت کو دیکھتے ہوئے میرے لئے سعادت کی بات ہے کہ ان سے کچھ معلومات اور تأثرات قارئین کے لئے کچھ مفید ثابت ہوں۔

عزیزی مولوی سید محمود حسن سلمہ نے جن کو تحریر وتقریر کا کچھ ذوق بھی ہے، انھوں نے خاص طور پر اس معاملہ میں دلچسپی لی اور خود ان مضامین کو جمع کیا اور ترتیب قائم کی اور اس کو قابل اشاعت بنا دیا، میں اپنے لئے سیرت پاک کی جو بھی چھوٹی موٹی خدمت مجھ سے ہوسکی اس کو باعث برکت وسعادت سمجھتا ہوں اور اس کی اشاعت سے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اپنے لئے نعمت سمجھتا ہوں۔ اس سلسلہ میں عزیز القدر مولوی سید بلال عبدالحی سلمہ بن سید محمد الحسنیؒ نے بھی تعاون کیا۔

حیدرآباد کے بعض دوستوں (جن میں الحاج انجینئر غلام محمد صاحب اور الحاج انجینئر محمد عبدالرشید صاحب پیش پیش ہیں) نے اس بات کا علم ہونے پر اس کے شائع کرنے کا ذمہ لیا، میں اپنے دیگر احباب ومعاونین کا بھی شکر گزار ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ ان سب کو بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے اور اس کوشش کو شرف قبولیت بخشے۔ اور ہمارے لئے سعادت وبرکت کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

محمد رابع حسنی ندوی

خاتون منزل، گولہ گنج لکھنؤ

دوشنبہ ۲۵ رصفر ۱۴۲۴ھ

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ

انسانی مخلوق کو زندگی کے صحیح اور مناسب کردار کے راستہ پر چلانے کے لئے ان کا پروردگار خود انسانوں میں سے ایسے اشخاص کو مقرر فرماتا رہا ہے جو اس کی دی ہوئی ذمہ داری کے کام کو اخلاص وہمت سے انجام دے سکیں، ہدایت کے اس اہم کام کے لئے پروردگار عالم کی طرف سے جو انسان مقرر ہوئے وہ نبی اور رسول کے لفظ سے یاد کئے جاتے رہے وہ اپنی نفسیاتی عقل وجسمانی خصوصیات میں مکمل اور اپنے ہم جنسوں میں فائق اور بلند خصوصیات کے حامل ہوتے تھے، یہ سلسلہ انسانوں کے مورث اعلیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک قائم رہا، انبیاء میں اعلیٰ خصوصیات وصلاحیتوں کے ہونے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو پیدا کئے جانے کے لحاظ سے حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے معاملہ میں بہتر ترین اور مکمل بنایا، اور اس کے لئے خاص طور پر آپ ﷺ کو زندگی کے مختلف ومتنوع نشیب وفراز سے گذارا جو انسان میں مختلف حالات کو جھیلنے اور مناسب راہ نکالنے کے لئے معاون ہوتے ہیں، اولاً آپ ﷺ کو یتیم پیدا کیا، پیدا ہونے کے بعد آپ ﷺ کی نگاہ جب باشعور ہوئی تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ آپ کو سایہ پدری حاصل نہیں جب کہ سیکڑوں آپ ﷺ کے ہم سنوں کو یہ حاصل

ہے، یہ بات ایک معصوم اور صغیر السّن بچہ کے قلب و ذہن کے لئے ایک بوجھ اور شکستہ دلی کا باعث ہوا کرتی ہے، پھر مزید یہ کہ چھ سال کی عمر میں ہی سایۂ مادری بھی باقی نہ رہا۔ اور اس کے بعد پھر شفقت کرنے والے دادا بھی ۸ سال کی عمر میں موجود نہ رہے، ان محرومیوں کو اگر بچہ بحسن و خوبی نہ جھیل سکے تو اس کی زندگی کی راہ پیچیدہ ہو جاتی ہے، اور زندگی میں اس کی کامیابی مبہم ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن اگر اس بوجھ کو خداداد ہمت سے وہ جھیل لے تو اس کی شخصیت میں مشکل حالات کو جھیلنے اور ان میں ضرورت اور پسند کی راہ نکالنے کی خاصی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہمت خصوصی طور پر عطا فرمائی جس کی بنا پر آپ ﷺ میں حالات اور واقعات کے تقاضوں کو مناسب ڈھنگ سے محسوس کرنے اور زندگی کے چیلنجوں کا مناسب ڈھنگ سے مقابلہ کرنے کی سمجھ اور ہمت پیدا ہوئی اور جلد ہی آپ ﷺ نے باعزت زندگی کی راہ اختیار کی، اور زندگی کو عزت نفس اور عالی ہمتی سے آراستہ فرمایا، مزید یہ کہ آپ ﷺ میں زندگی اور کائنات کے سربستہ راز کو سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کا ذوق پیدا کیا چنانچہ آپ ﷺ نبوت ملنے سے قبل ہی شہر کی آبادی سے نکل جاتے اور آبادی سے الگ ایک غار میں کچھ وقت گذارا کرتے، ظاہر ہے آپ ﷺ کا تنہائی اور تخلیہ میں کچھ وقت گذارنے کا جذبہ و تقاضہ اعلیٰ حقیقت کی طلب اور اس کے سلسلہ میں غور و فکر کے لئے رہا ہوگا انہی جیسے احساسات کے نتیجہ میں تھا، پھر چونکہ پروردگار عالم نے عربوں اور غیر عربوں کے حق اور خدا کی بندگی کی صحیح راہ سے بہک جانے کو دیکھتے ہوئے ان کی ہدایت کے لئے آپ ﷺ کو مقرر کرنا طے کیا، اس لئے پردۂ غیب سے وہ اشارے آنے لگے اور نبوت ملنے سے قبل ہی حجر و شجر سے اللہ کے نبی کے عنوان سے مخاطب کرنے کی آوازیں بھی آنے لگیں جن کو سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تعجب سے متوجہ ہو جایا کرتے لیکن کوئی قائل نظر نہ آتا کانوں کو ان صداؤں سے آشنا کر دینے کے

بعد باقاعدہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ان صداؤں کی حقیقت لے کر آپ ﷺ کے پاس آپ کے تخلیہ کی جگہ غارِ حرا پہنچے، اور نبوت کا پیغام پہنچایا، پھر وقت کے کچھ فرق سے اپنی اصل شکل میں بھی اُفق پر ظاہر ہوئے تاکہ ذہن کے کسی گوشہ میں پیغام خداوندی کے لانے والے اس فرشتہ کو نامعلوم محسوس کرنے کا کوئی شائبہ نہ رہ جائے۔

اس طرح آپ ﷺ پر نبوت ورسالت کا وہ عظیم بار ڈالا گیا جو وسعت کے لحاظ سے دیگر تمام انبیاء پر نہیں ڈالا گیا تھا، جس کو آپ ﷺ کے خداداد فراست رکھنے والے قلب وذہن نے اس کی ذمہ دارانہ اہمیت کو محسوس کیا، اور آپ ﷺ نے اپنی عاقل مخلص اہل خانہ سے بھی اس واقعہ کا اور اس کے عظیم بوجھ محسوس کرنے کا تذکرہ کیا، انہوں نے تسکین دی اور آپ ﷺ کی اعلیٰ انسانی صفات، کریم النفسی اور اعلیٰ انسانی کردار کی مثالوں کے حوالہ سے اس کو بلند اور مقدس ذمہ داری قرار دیا اور مزید تقویت کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے آشنا اپنے بھائی ورقہ بن نوفل سے جا کر تصدیق کرائی، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ میں اس بار کے اٹھانے کی صلاحیت ودیعت کی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے اس بارِ عظیم کو یعنی عظیم دعوت دین کی خاردار گزرگاہوں میں چلنے کو ہمت وبلند نظری سے قبول کیا، اور ہمت اور عزیمت کے ساتھ نبھایا، آپ ﷺ نے آغاز عمر سے ہی زندگی کی خاردار راہ کو طے کیا تھا۔

باپ کی طرف سے یتیمی کے مرحلہ سے آپ ﷺ کو پیدائش سے قبل ہی سابقہ پڑا تھا، پھر ماں کی طرف سے یتیمی، پھر قریبی مشفق ومربی یعنی دادا کی بھی ۸ سال کی عمر تک پہنچنے پر جدائی ہوگئی، لیکن اللہ تعالیٰ کی نظر کرم رہی اور اس نے مشفق چچا عطا فرمایا جس کی ہمدردی وشفقت سے عمر کے پختہ ہوجانے کی مدت تک تعاون ملتا رہا اور جو نبوت ملنے کے بعد نبوت کے کام میں اپنوں کی دشمنی اور ایذا رسانی کو ناقابل برداشت حد تک پہنچنے سے بچانے میں معاون رہے، اسی کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کو بفضل الٰہی

ایک نہایت سمجھدار اور باہمت وہمدرد صفت اہلیہ بھی ملیں، جنھوں نے آپ ﷺ کا مشکلات کے موقعوں پر بہت ہمدردانہ ساتھ دیا لیکن رب العالمین نے دونوں کی طرف سے حصول ہمدردی کے اس مرحلہ میں کچھ عرصہ رکھنے کے بعد اس تعاون کی سہولت بھی آپ ﷺ سے ہٹالی کہ آپ ﷺ اس سے بھی مستغنی ہوکر اپنی راہ بنائیں اور اپنے خدا کی مدد پر انحصار کرتے ہوئے اب آپ ﷺ صرف اپنے رب کی نگہبانی میں ہی مسئلے حل کریں، جس نے یہ عظیم ذمہ داری ڈالی ہے اس کی طرف سے مدد ہوتی رہے گی لیکن صبر وہمت اور تنہا اپنے رب پر بھروسہ کا ثبوت دینا ہوگا، چنانچہ آپ ﷺ نے دعوت کے کام کی خاردار راہوں پر چلتے ہوئے نبوت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں صرف دس سال گذارے تھے کہ مذکورہ بالا دونوں مشفقانہ وہمدردانہ تعاون کے سہارے بھی ختم ہوگئے، سخت آزمائش کے کئی موقعوں پر ایسے میں آپ ﷺ کی شخصیت وصفت برداشت اس عظیم معیار کے مطابق ظاہر ہوئی، اگر نہ ظاہر ہوئی ہوتی تو شاید برداشت سے باہر ہوجاتا، لیکن اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو نبوت کے اس عظیم منصب پر سرفراز کرایا تھا جس میں مشکل سے مشکل حالات کا بخوبی مقابلہ کرنے کی طاقت عطا کی تھی لہذا مکہ کے کافر آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو اتنی ایذا پہنچاتے تھے کہ برداشت سے باہر ہوجاتا تھا یہ آپ ﷺ کی تربیت اور تسکین صبر کے نتیجہ میں تھا، ان کی اس ایذا رسانی سے بعض بعض کی موت تک واقع ہوئی ہے، خاص طور پر جو افراد قریشی خاندان کے نہ ہوتے یا غلام ہوتے ان کو حد سے زیادہ ایذا برداشت کرنا پڑتی، جیسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں آیا ہے کہ گرم پتھر پر لٹائے جاتے تھے اور گرم پتھر سے ان کے جسم کو داغا جاتا تھا کہ وہ، وہ نہ کہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں لیکن وہ عزیمت کے پیکر تھے ''احد احد'' یعنی خدا تو ایک ہی ہے خدا تو ایک ہی ہے'' کہتے، اور عقیدۂ توحید سے روگردانی نہ کرتے خاندانِ یاسر کے افراد کو تو اتنی ایذا دی جاتی کہ لوگوں کو دیکھنا مشکل

ہو جاتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی طرف کسی وقت گزر ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے ”صبرا یا آل یاسر موعدکم الجنۃ“ اے یاسر کے خاندان والو! صبر کرو تم کو جنت ملے گی“ حضرت یاسرؓ ثابت قدم رہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا کہ صرف برداشت کرنا ہے بدلہ نہیں لینا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی تربیت وتعلیم اور اخلاق ومحبت کی اثر انگیزی آپ ﷺ کے رفقاء کے لئے ان ایذا رسانیوں میں صبر وہمت پیدا کرتی تھی آغاز اسلام سے ۱۳ رسال تک کی یہ مدت اسلامی دعوت وایمانی تربیت کے ساتھ اسی صبر وبرداشت میں گذری۔

ایک موقع پر ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ یا رسول اللہ اب تو برداشت سے زیادہ ہوگیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا ابھی سے تم بے قرار ہوگئے تم سے پہلے کی امتوں پر ایسے ایسے حالات گزرے کہ ان کے بدن لوہے کی کنگھیوں سے نوچے گئے اور انہوں نے صبر کیا، صبر کرو تم اطمینان رکھو ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم غالب ہوگے، اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کبھی گندگی ڈال دی جاتی تھی کبھی دوسری قسم کی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں کبھی راستہ پر کانٹے بچھائے جاتے تھے اور ایک موقع پر ابوجہل جو آپ کا بڑا مخالف، تھا آپ ﷺ کے ساتھ بڑی ایذا رسانی سے پیش آیا آپ ﷺ کو بہت تکلیف ہوئی لیکن آپ ﷺ نے کچھ نہیں کیا، تھوڑی دیر میں آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن بھتیجے کے ساتھ بدسلوکی سن کر غصہ آگیا اور جاکر ابوجہل کو زدوکوب کیا اور کہا کہ ہمت ہو تو ہمارے ساتھ کرو اور جوش میں آکر مسلمان ہوگئے اور اسلام ومسلمانوں کی تقویت کا باعث بنے، اور ایک موقع پر حضرت عمرؓ بن خطاب جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح اسلام دشمن بنے ہوئے تھے اور خاندان میں سخت دل مشہور تھے، کہنے سننے میں جوش میں آگئے اور کہنے لگے کہ ابھی جا کر محمد (ﷺ) کا

کام تمام کر دیتا ہوں تا کہ قصہ ختم ہو، چنانچہ وہ لوگوں کے کہنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی نیت سے نکلے لیکن راستہ میں اپنی بہن کے گھر سے گزرے اور ان سے الجھے اور بہن کو مارا بھی پھر شرم آئی اور بات بنانے کے لئے کہنے لگے کہ اچھا وہ قرآن دکھاؤ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے، اس کو پڑھنے پر دل پر اثر پڑا اور ان کی ترغیب پر مسلمان ہونے کی نیت کر لی، اور اپنے برے ارادہ سے باز آ گئے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کے اس تیرہ سالہ ابتدائی دور میں صرف صبر کرنے کا حکم تھا، فرمایا "كُفُّوا أَيْدِيَكُم وَأَقِيمُوا الصَّلاة" اپنے ہاتھوں کو تھامے رکھو اور نماز قائم کرو یعنی رجوع الی اللہ اور دعا، عبادت سے قوت حاصل کرو، ایذا رسانیوں کو برداشت کرو، انتقام نہ لو، چنانچہ تمام مسلمانوں نے اس حکم کی بجا آوری پوری اطاعت واخلاص سے کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مسلمانوں نے ایمان اور اطاعت الٰہی کے راستے میں ہر طرح کی قربانی کے جذبہ کی تربیت حاصل کر لی، یہ ۱۳ سالہ دور مسلمانوں کے ایمان اور حق کے لئے ہر طرح کی قربانی برداشت کرنے کی تربیت کا دور تھا اور یہ دراصل ان کی اس غیر معمولی تربیت کا دور رہا جس کے بعد ان کو اپنے دین وایمان کے لئے کسی طرح کی قربانی دینے میں تردد یا بے ہمتی دکھانے کی کمزوری باقی نہیں رہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ایسی جماعت بننا تھا جو اللہ کے لئے اپنی جان ومال قربان کرنے میں کوئی جھجک نہ رکھتی ہو، اور یہ بات اس امتحانی وتربیتی دور سے گذرنے پر مسلم معاشرہ کو بخوبی حاصل ہوگئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال اس سلسلہ میں سب سے زیادہ معیاری تھی مکہ کی زندگی میں دشمنانِ اسلام کا اصل نشانہ وہی رہے، آپ ﷺ بیت اللہ شریف میں نماز پڑھنے آتے اور دشمنوں کی طرف سے سب وشتم سنتے اور نماز پڑھ کر خاموشی سے واپس چلے جاتے ذرا مشتعل نہ ہوتے، آپ ﷺ کے کاندھوں پر اوجھڑی بھی ڈالی گئی جس

کے اثر سے سجدہ سے اٹھنا مشکل ہو گیا، صاحبزادی صاحبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو انھوں نے آکر اس گندگی کو ہٹایا، راستے میں کانٹے بچھائے جاتے، آپ ﷺ یہ سب خندہ پیشانی سے برداشت کرتے، آپ ﷺ کی دو صاحبزادیوں کو جو ابولہب کے بیٹوں کی بیویاں تھیں ابولہب نے اپنے بیٹوں پر زور ڈال کر طلاق دلوادی، اور ایک موقع پر قریش کے سب سردار ابوطالب کے پاس پہنچے اور ان سے سخت انداز میں کہا کہ اپنے بھتیجے کو روکیں ورنہ وہ لوگ کارروائی کریں گے، ابوطالب پریشان ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ بھتیجے! قوم کے سردار میرے پاس آئے تھے اور تمہارے سلسلہ میں منع کرنے کے لئے کہہ رہے تھے، میں بوڑھا ہو گیا، مخالفت زیادہ نہیں جھیل سکتا، مجھ پر رحم کرو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا کہ رعایت اور خیال کرنے والے چچا بھی اب ہمدردی سے منہ موڑ رہے ہیں آپ ﷺ کو اپنے چچا سے ان کی ہمدردی اور شفقت طویل عرصہ سے مسلسل ملنے کی وجہ سے ان کی یہ معذرت بہت محسوس ہوئی، لیکن دین کا معاملہ تھا آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس کو تو نہیں چھوڑ سکتا خواہ یہ لوگ سورج وچاند توڑ لائیں اور میرے ہاتھ پر رکھ دیں، یہ فرما کر آپ ﷺ لوٹنے لگے، چچا کی اس معذرت سے آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، چچا نے دیکھا ان کے دل پر اثر پڑا چنانچہ آواز دی بلایا اور کہا جاؤ تم کو نہیں چھوڑوں گا، خواہ یہ لوگ کچھ کہیں تم اپنا کام کرتے رہو، ایسی محبت و ہمدردی والا چچا لیکن جب ابوطالب کا انتقال ہونے لگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کلمۂ توحید کہنے کے خواہش مند ہوئے کہ آپ اتنا کہہ دیں باقی کے لئے میں اللہ تعالیٰ سے عرض کروں گا، لیکن انھوں نے قوم کی تنقید کے ڈر سے کلمہ پڑھنے کا عمل نہیں کیا، اگرچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ محسوس کیا کہ خاموشی سے انھوں نے وہ کلمہ پڑھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میں نے نہیں سنا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا لیکن دین کے بدلنے کے لئے ان کی مروت نہیں کی، اور نہ جبر سے کام

لیا، کبھی اسلام کے حوالہ سے ابوطالب کے لئے توقع کا کوئی لفظ کہا اور اپنے والدین کے لئے دین کے معاملہ میں بھی کوئی ایسی بات نہیں فرمائی، آپ ﷺ کی وہ ایمانی شان بھی جو آپ ﷺ کے رسول آخرالزماں کے مقام کے لائق تھی کہ کوئی کتنا ہی محبوب اور عزیز ہو اسلام کے تقاضے کے خلاف کوئی رعایتی لفظ نہیں فرمایا، خواہ دنیاوی تعلق کیسا قریب اور خاندانی ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں کفار کی طرف سے ایذارسانی اور اس کے لئے برداشت کے سلسلے میں جو سخت آزمائشی مواقع پیش آئے ان سے ذہنی پریشانی بھی بہت ہوتی، اور ابوطالب کے نہ رہنے سے بعض سنگین خطرات کا اندیشہ بھی بڑھ گیا، اس صورت میں آپ ﷺ کو خیال آیا کہ مکہ کے ہمسر شہر طائف کی کسی بزرگ شخصیت کی انسانی ہمدردی اگر حاصل ہو جائے تو دعوت کے کام میں خطرات کی کمی ہو سکتی ہے، یہ صورت اس لئے بھی مناسب معلوم ہوئی کہ ایک ہی وقت میں آپ ﷺ کے چچا اور آپ ﷺ کی اہلیہ دونوں آپ ﷺ سے جدا ہو گئے تھے اور آپ ﷺ کو کسی مضبوط شخصیت کی ہمدردی وتعاون کے حصول کی ضرورت محسوس ہوئی تھی جس کی بنا پر، اور آپ ﷺ کی نظر طائف پر پڑی جہاں اس علاقے کی بااثر خاندانی شخصیتوں میں کئی ایک تھیں آپ ﷺ نے وہاں جا کر ان سے بات کرنے کا ارادہ کیا اور بروقت سفر کر کے وہاں تشریف لے گئے اور وہاں کے تین سربراہوں میں سے کسی ایک کی حق کی خاطر ہمدردی وحمایت چاہی، لیکن خدا کو یہاں بھی آپ ﷺ کے عزم واستقامت اور صبر وبرداشت کو ہی مقدم رکھنا تھا لہٰذا ان سے ہمدردی نہیں ملی اور انھوں نے مسافروں کے ساتھ کیا جانے والا عربی اخلاق بھی آپ ﷺ کے ساتھ نہیں برتا، اور قریش کے مخالفانہ رویہ کو بنیاد بناتے ہوئے آپ ﷺ سے ہمدردی کرنے کو مسترد کر دیا بلکہ عام انسانی اخلاق کے برعکس شہر کے اوباش لوگوں کو پتھر مارنے پر لگا دیا جس سے آپ ﷺ کے قدم مبارک لہولہان

ہوگئے، پردیس میں اور ایسی بے بسی کی حالت دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو خصوصی رحم آیا اور خصوصی مدد کی پیشکش ہوئی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام پیغام لائے کہ زلزلہ کے ذریعہ ان ظالموں کو سخت سزا دی جاسکتی ہے، لیکن آپ ﷺ نے عبدیت کے اعلیٰ معیار کو ترجیح دی سزا دینے کی فرمائش نہیں کی اور اپنی دعا میں صرف اپنی بے بسی کے اظہار کے ساتھ حق کے لئے صبر و برداشت اور اپنے رب کی خوشنودی ہی پر اکتفا کرنے کو اختیار کیا جس کا اظہار آپ ﷺ کی اس دعا کے الفاظ سے ہوتا ہے جو اس موقع پر آپ ﷺ نے ادا فرمایا۔

دوسرا موقع وہ آیا جب آپ ﷺ کے خاندان نے آپ ﷺ کی جان ہی لے لینے کا منصوبہ بنایا، اپنے باا ثر مشفق چچا کے فوت ہوجانے کے بعد ہی سے آپ ﷺ کے قبیلہ کے جانی دشمن حضرات مزید بیباک اور ظالم ہوگئے تھے، اب انھوں نے اس منصوبہ کو ایک رات انجام دینے کا پروگرام بنالیا ان کے اس مصمم ارادہ قتل اور اس کی کھلی ہوئی کوشش کے علم میں آنے پر جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو ملی چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے رب کی اجازت سے رات کے اندھیرے میں وطن عزیز کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور مدینہ منورہ کا سفر فرمایا جہاں کے لوگ پہلے سے ہمدردی اور تعاون کا یقین دلا چکے تھے، اور آپ ﷺ کے وطن عزیز چھوڑ کر وہاں منتقل ہوجانے پر انھوں نے پورا تعاون بھی دیا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پہلے اس شہر کے لوگوں کی ہمدردی سے مستفید ہونے لگی تھی، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہاں آجانے سے مسلمانوں کی اپنی ایک جمعیت اور سوسائٹی قائم ہوگئی، جو با اختیار زندگی کی سہولت رکھتی تھی، اور اپنا خود اختیاری نظام قائم کرسکتی تھی، لہٰذا یہاں سے مسلمانوں کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، آپ ﷺ کا اور آپ کی زندگی کا یہ نیا مرحلہ بھی راحت وعیش کا نہ تھا، یہ نیا مرحلہ بھی آزمائشوں اور مشکل حالات سے گزرنے اور ایمان ویقین اور حکمت وصبر کی

صفات کے ساتھ اس نظام زندگی کی دشواریوں سے گزرنے اور اس کے لائق حکمت عملی اختیار کرنے کا مرحلہ تھا، پہلا مرحلہ جو مکہ کا تیرہ سالہ مرحلہ تھا زندگی کی انفرادی مشکلات اور عزیز واقارب کی عداوتوں اور ایذا رسانیوں کو پوری سیر چشمی کے ساتھ برداشت کرنے میں گزرا، ایمان وعزیمت، دعوت وتبلیغ اور مکارم اخلاق کا تھا جس میں ظلم کا جواب دینے یا اس کا انتقام لینے کی اجازت نہ تھی، اب نئے مرحلہ میں دعوت کے مقصد کو سینے سے لگائے ہوئے اجتماعی زندگی کو مرتب کرنے اور اس کے معاملات کو دین حق کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے انجام دینا تھا، اور عزیز واقارب کے دائرہ سے آگے بڑھ کر مختلف النوع افراد اور جماعتوں اور مخالفوں سے معاملہ تھا، یہ نظام زندگی بھی اپنی الگ نوع کی مشکلات رکھتا تھا، اور اس میں اجتماعی زندگی کے بھی چیلنج سامنے آرہے تھے، جن کا مقابلہ بھی کرنا تھا اور جواب بھی دینا تھا، مکہ کی زندگی میں مسلمان مغلوب اور کمزور تھے، لیکن آپ ﷺ ایمان وعمل میں پختہ اور ناقابل شکست ہمت وعزیمت کے مالک تھے، مقابلہ میں کمزوری اور برداشت کے ساتھ عقیدہ وعمل میں ہمت وعزیمت کو بہت صبر وحکمت کے ساتھ جمع کئے ہوئے تھے، اب مدنی زندگی میں کمزوری کی جگہ اجتماعی طاقت حاصل ہوگئی تھی، اس کی بنا پر اپنے دشمنوں سے اجتماعی سطح پر معاملہ رکھنا تھا، اور ان کی دشمنی پر مناسب ردعمل ظاہر کرنا تھا، اس طرح سے ان نئے حالات میں نئے اسلوب وطریقہ سے ہمت وعزیمت کو اختیار کرنا تھا، سابقہ صورت حال بدل جانے کی دشواریوں میں تبدیلی نہیں آئی البتہ اب دشواریوں کا طرز دوسرا ہوگیا، اب اجتماعی نظام زندگی میں ابھرنے والی مشکلات سامنے آئیں جن کے لئے ہمت وعزیمت اور صبر وحکمت کی اسی طرح ضرورت باقی رہی جو پہلے تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو اس کے مطابق چلایا اور نظام زندگی کو نئے تقاضوں کے مطابق بنایا اور مشکلات کے مقابلہ میں صبر وعزیمت کا پورا ثبوت دیا۔

مسلمانوں پر اب ان کے دشمن مسلح اجتماعی طاقت سے حملہ آور ہوتے اور آپ مسلمانوں کے ساتھ ان کا اسی کے مطابق مقابلہ کرتے، پھر خود شہر کے اندر اجتماعی زندگی میں انفرادی مخالفانہ جذبات وعزائم جو دشمن فرقے یہودیوں کی طرف سے اور منافقین کی طرف سے پیش آئے ان کو جھیلتے اور ان کے سلسلہ میں مناسب رویہ اختیار کرنے کا عمل نہایت تحمل کے ساتھ کبھی برداشت کے ساتھ کبھی جزم وحزم کے ساتھ اختیار کرتے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ اور جامع انسانی صفات عطا فرمائی تھیں، ایسی صفات کہ جن سے اپنے معاشرہ میں زبردست وقار قائم ہوا، اور پُر ہمت اور پُر عزیمت تقاضوں میں جن سے معاشرہ کے معاملات پڑسکتے تھے، اس میں ہمت وعزیمت کے لحاظ سے کوئی کوتاہی بھی نہیں کی، اور اعلیٰ مقصد کے لئے اپنے عزیز اور قدردانوں سے کسی بھی اختلاف ہونے پر کریمانہ برتاؤ ہی اختیار کیا۔

زندگی کے مختلف مراحل میں جیسا جیسا تقاضا پیدا ہوا، اس کو اعلیٰ اُصول اور مقصد بلند کے بموجب ذمہ داری بخوبی انجام دی، زندگی کے شعور کا زمانہ جو عموماً انسان کے چھ سالہ عمر سے شروع ہوتا ہے، آپ ﷺ کے لئے حالات بالکل ناسازگار تھے، ماں باپ دونوں سے محرومی ہو چکی تھی، لیکن آپ ﷺ نے اپنی شخصیت کی تعمیر میں اس کو اثر انداز نہیں ہونے دیا، اور قریب تر اعزہ سے جو محبت مل سکتی تھی اسی سے کام چلایا، آغاز جوانی تک اپنے شریفانہ اخلاق کو اپنے پورے معاشرہ میں تسلیم کرالیا، اور عملی زندگی میں معاش کی ضرورت کو شریفانہ انداز میں پورا کیا اور عائلی زندگی بھی اچھے معیار سے شروع کی، اور نبوت کی ذمہ داری ملنے پر اس کے اعلیٰ تقاضوں کو بخوبی پورا کیا، اور اس سلسلہ میں جو مصائب پیش آئے خندہ پیشانی سے گوارا کیا، بالآخر مخالفوں نے آپ ﷺ کی

زندگی ہی کو جب ختم کرنے کا تہیّہ کرلیا تو نقل مکانی کی اور نیا دور شروع کیا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے خصوصی نظام کے تحت انجام پایا جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى ٥ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ٥ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُوْلٰى ٥ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ٥ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ٥ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى ٥ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى ٥ فَأَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ٥ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ٥ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ٥ (سورۃ الضحیٰ)

جس کا مجموعی مفہوم حسب ذیل ہے:

اس سورہ میں دن کے آغاز اور رات کے سکون کے حوالے سے کہ جو انسان کے دن کے حرکت وعمل اور پھر رات کے آرام اور سکون کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، فرمایا گیا کہ آپ کو آپ کے رب نے چھوڑ نہیں دیا ہے، نظر انداز نہیں کردیا ہے اور نہ اپنی پسند سے ہٹایا ہے، البتہ آخرت کا معاملہ آپ کے لئے اس زندگی کے معاملہ سے زیادہ بہتری کا ہے، اور آپ کو عنقریب آپ کا رب اتنا عطا فرمائے گا کہ آپ خوش ہوجائیں گے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ہم نے آپ کو یتیم پایا تو آپ کے لئے ٹھکانہ کا انتظام کیا، اور آپ کو گم گشتہ راہ پایا تو آپ کو صحیح راہ پر ڈالا، اور آپ کو معاشی لحاظ سے دوسروں کا دست نگر پایا تو آپ کو مستغنی اور خود کفیل کردیا، اب اس کا آپ خیال رکھیں کہ

یتیم پر سختی نہ کریں، اور مانگنے والے کو جھڑکیں نہیں اور آپ پر آپ
کے رب کے جو احسان ہیں (یعنی نبوت کا احسان اور دوسرے
احسان) اس کا آپ تذکرہ کریں اور لوگوں کو بتائیں (یعنی ان کو راہ
حق کی طرف متوجہ کریں۔

مکہ مکرمہ میں جب دشمنی برداشت کرنے میں حد سے بات آگے بڑھ گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حکم سے مدینہ منورہ منتقل ہوئے لیکن مکہ کے دشمنوں نے آپ ﷺ کے مدینہ چلے جانے پر بھی آپ ﷺ سے دشمنی ترک نہیں کی اور باقاعدہ جنگ کے حالات پیدا کرنے لگے، چنانچہ یکے بعد دیگرے مسلمانوں پر جنگ مسلط کی پہلی جنگ کفار قریش نے تین سو کیلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے مدینہ منورہ سے صرف ڈیڑھ سو کیلو میٹر کے قریب پہنچ کر اور دوسری جنگ ساڑھے چار سو کیلو میٹر طے کر کے مدینہ طیبہ پہنچ کر کی، اسی طرح جنگیں ہوتی رہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکمت وتدبر سے اور اعلیٰ انسانی کردار کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، مدینہ منورہ میں یہود کی ایک تعداد بھی تھی جن سے آپ ﷺ نے معاہدہ کیا تھا، لیکن اندر سے یہود نے کفار مکہ سے سازش کی جس کے ثابت ہونے پر معاہدہ کی خلاف ورزی کی بنا پر ان کے خلاف بھی کارروائی کرنی پڑی، یہ سب ایسی حکمت وتدبر سے آپ ﷺ نے کیا کہ اس میں عقل وحکمت، انسانیت وشرافت دوست ودشمن کا لحاظ اور ممکنہ انسانی رعایت سب کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں، اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے چاروں دور، بچپن سے لے کر جوانی تک جوانی سے نبوت کے ملنے تک اور نبوت کا مکی دور اور پھر مدنی دور، یہ سب اعلیٰ کردار، نیک نفسی، سمجھداری، زندگی کے تقاضوں کو مناسب انسانی اُصولوں کے مطابق پورا کرنے، پھر معاشرہ کے تعلقات اور روابط اور پھر منفی ومثبت دونوں حالات کا مناسب ڈھنگ سے حق ادا کرنے اور دوست ودشمن کے ساتھ الگ الگ

لیکن شریفانہ انسانی کردار کے دائرہ میں رہتے ہوئے معاملہ کرنے کے، ایسے غیر معمولی اور مثالی نمونے پیش کیئے گئے کہ غور کرنے پر عقل دنگ رہ جاتی ہے، ان مثالوں کو اگر وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے تو چند سطریں نہیں کتاب کی جلدیں چاہئیں، ہم کو سیرت کا مطالعہ اس کے مختلف حالات کے مذکورہ پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کرنا چاہیئے تو ہمارے سامنے ایک عظیم دنیائے انسانیت کھل کر سامنے آتی ہے، اور مسلمان کے لئے زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر طرح کے حالات میں یہ باتیں اعلیٰ نمونہ بنتی ہیں اور ان کو نمونہ بنانے کا قرآن مجید میں بھی حکم آیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيراً ٥

(سورہ احزاب:۲۱)

"تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔"

مدینہ منورہ میں اپنے ماننے والوں کی اکثریت اور سازگار ماحول قائم ہو جانے سے دین پر اسلام کے تقاضوں کے مطابق اجتماعی و معاشرتی زندگی قائم کرنے کی سہولت حاصل ہوئی اور دین حق کی دعوت زیادہ وسیع طریقہ سے پہنچانے کا موقع ملا، اس طریقہ سے مکمل دین حق کو انفرادی و اجتماعی زندگی میں قائم کیا گیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی رہنمائی میں اور اپنے نبوی طریقۂ کار سے اعلیٰ انسانی اور ربانی خصوصیات کا معاشرہ تیار کیا جس کے اقدار اور طریقہ ہائے عمل صرف معین ہی نہیں کیئے بلکہ ان کی تربیت دی جس میں اعلیٰ اخلاق، معیاری انسانی کردار، ایک دوسرے کی ہمدردی اور خیر خواہی اور حق کے راستہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں تک کو دین و آخرت کی

کامیابی کا پیغام پہنچایا، اور محدود دائرہ سے نکل کر وسیع تر پورے ملکی دائرے بلکہ مزید عالمی دائرہ تک انسانی صلاح وفلاح کا پیغام پہنچانے کا کام شروع ہوگیا۔ اس کے لئے یہ سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ غزوۂ بدر جو کہ جنگ اور جہاد کا پہلا واقعہ ہے۔ ۱۳؍سال کی مکی زندگی میں مسلسل اور سخت سے سخت تکلیفیں جھیلنے اور ظلم وتشدد برداشت کرنے اور یک طرفہ صبر وبرداشت کا ثبوت دیتے ہوئے بالآخر وطن ومال ومتاع کو خیر باد کہہ کر منتقل ہوجانے پر مجبور ہونے کے بعد پیش آیا، مکہ کی ۱۳؍سالہ مدت میں مسلمانوں کو مشرکین مکہ کی طرف سے کئے جانے والے ہر ظلم کو برداشت کرتے رہنے کی تلقین کی گئی تھی، جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے وہ یہ کہ ''اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرتے رہو'' چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا ایک ذرّہ بھی انتقام یا مقابلہ کا طریقہ اختیار نہیں کیا اور صرف اپنی اصلاح اور دوسروں کو نصیحت پر اکتفا کرتے رہے، لیکن جب وطن چھوڑ کر پردیس میں مقیم ہوجانے پر بھی ظلم وزیادتی وہاں تک پہنچانے کی کوشش ہونے لگی تو مسلمانوں کو اجازت ملی کہ وہ اپنے کو منظّم کر کے مقابلہ کر سکتے ہیں، چنانچہ دشمنی کا جواب دینے کا یہ پہلا موقع تھا، جو بدر میں پیش آیا، وہ محض اللہ کے بھروسہ پر میدان جنگ میں آئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی مدد آئی، فرشتوں نے باقاعدہ جنگ میں شرکت کی اور مشرکین کی فوج کو کھلی شکست ہوئی اور مسلمانوں کو ۱۳؍سال کی مشقتوں کا پہلی بار صلہ ملا، یہ صلہ تین خصوصیات کا حامل تھا۔

پہلی خصوصیت تو یہ کہ ۱۳؍سال تک تکلیف دہ حالات میں بھی اعلیٰ کردار اور انسانیت نوازی پر قائم رہے، اور محض حکم الٰہی کی تعمیل میں سخت سے سخت زیادتی کا بھی جواب دینے سے گریز کرتے رہے اور انتقامی کاروائی کے لئے حکم الٰہی کے منتظر رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکموں پر پوری عمل داری میں صبر وبرداشت کا ثبوت دینے کے امتحان میں وہ سو فیصد کامیاب رہے، ان میں وہ اعتماد پیدا ہوا جس نے ان کی آئندہ کی

زندگی کو جدوجہد کی راہ میں ان کے قدموں کو مضبوط بنایا اور ہمت بڑھائی، اور وہ اپنے پروردگار کے فرمانبردار بندے ہونے کے ساتھ ایک ناقابل شکست طاقت بن گئے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس صبر وثبات اور حق کے لئے جانی ومالی تکلیف اٹھانے کو قبول فرمایا اور ان کو جنت کا مستحق قرار دیا، جو نہایت غیر معمولی بشارت اور خوش خبری کی بات ہے۔

تیسرے یہ کہ دشمن کی دشمنی کا جواب دینے کی اجازت ملنے پر ان کو مقابلہ کا موقع ملا اور اس دشمن کو جو کبر ونخوت اور ظلم وتشدد میں شیر بنا ہوا تھا، مسلمانوں کے مظلوم ہاتھوں سے شکست ہوئی اور دشمن کے سامنے اپنے کو سربلند کرنے اور اعتماد کے ساتھ مقابلہ کرنے کی قوت حاصل ہوئی، مسلمانوں کو اپنے دین کی عظیم قدروں کی پابندی کرنے پر ان کو بدر کی فتح کی صورت میں مذکورہ بالا فائدے حاصل ہوئے اور وہ طاقتور اور پروقار امت ہوئے، پھر وہ دشمنوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرتے ہوئے، ۸ھ میں مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہونے کے لائق ہوئے اور یہ فتح انہوں نے بغیر جنگ اور بغیر فوج کشی کے حاصل کی، اور انھوں نے دیکھا کہ اعلیٰ قدروں پر قائم رہتے ہوئے اعلیٰ کردار پر عمل کرنے سے وہ کامیابی ملتی ہے جو محض طاقت کے انحصار سے نہیں ہوتی۔

سیرت کا پورا جائزہ لینے سے یہ بات صاف اور نمایاں نظر آتی ہے کہ انسانی معاشرہ کے بھٹکتے ہوئے معاشرے کو راہ حق پر لگانا اور انسان کو حیوانی بھٹکتی ہوئی راہوں سے ہٹا کر اپنے خالق ومالک کے احکام کی تابعداری اور شریفانہ انسانی کردار آپسی انسانی ہمدردی اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے لائق صفات واخلاق اختیار کرنے کی دعوت اور اس کے لئے انتھک کوشش مقصد بنی ہوئی تھی اور سیرت کا مطالعہ کرنے والے کو سارے واقعات اسی کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں، اور یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقابلہ وجنگ بہت محدود اور اعلیٰ انسانی اخلاق کے دائرہ کے اندر

رہتے ہوئے کی گئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے واقعات اور حالات آپ ﷺ کے رب کی طرف سے ایسے تشکیل دیئے گئے کہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لئے زندگی کے ہر موڑ اور ہر صورت حال میں اُن سے نمونہ مل سکے، اس کے لئے ایسے نمونے رہتی دنیا تک مہیا کئے جانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشقتوں سے بھی گزارا گیا، شخصی نقصانات سے بھی گزارا گیا، تکلیف ومشقت اور راحت ومسرت دونوں طرح کے حالات سے گزارا گیا، اس طرح آپ ﷺ کی حیات طیبہ ساری انسانی برادری کے لئے اعلیٰ مثال بھی ہے اور تعلیم وتربیت اور حق کی رہنمائی کا بہترین اور اعلیٰ ذریعہ بھی ہے۔

صلی اللّٰہ علیه و سلّم تسلیماً کثیراً کثیراً

آپ ﷺ پر ہزاروں درود وسلام ہو، کہ امت کے فائدہ کے لئے اور رہنمائی کے لئے آپ ﷺ کو سب تکلیفیں اٹھانی پڑیں اور اعلیٰ صبر ورضا اور وسیع القلبی کا ثبوت بھی دینا پڑا۔

حضور اکرم ﷺ سے محبت
تکمیل ایمان کے لئے لازمی

حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "لَا یُؤمِنُ أحَدُکُم حَتّٰی أکونَ أحبَّ إلیہ من والِدہ وولدِہ والناسِ أجمعینَ" کہ کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک میری محبت اس کے دل میں اس کی محبت سے بھی زیادہ نہ ہو جو اس کو اپنے باپ سے، اپنی اولاد سے اور تمام لوگوں سے ہے، اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہر صاحب ایمان کے لئے لازمی اور ضروری بن گئی ہے اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے احسان کے بعد سب سے بڑا احسان تمام مسلمانوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، انھوں نے زندگی کو اپنے حقیقی مالک اور پروردگار کی مرضی کے مطابق گذارنے کا طریقہ بتایا، پھر اس کی تربیت دی، آخرت میں کامیابی کا طریقہ بتایا جس سے ہر انسان کو مرنے کے بعد سابقہ پڑنا ہے اور یہ سابقہ چند گھنٹوں یا چند دنوں یا چند مہینوں کا نہ ہوگا بلکہ ابدالآباد کی اور نہ ختم ہونے والی زندگی کا ہوگا، ہماری یہ دنیا کی زندگی تو بہت مختصر زندگی ہے، اس میں بچپنے کا زمانہ نکال دیا جائے تو عام طور پر پچاس سال کے نیچے ہی ختم ہو جاتی ہے، لیکن مرنے کے بعد کی زندگی نہ ختم ہونے والی کروڑوں اور اربوں سال سے بھی زیادہ کی زندگی ہوگی، اس زندگی میں کامیابی، راحت اور نعمت حاصل کرنے کا گر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی

معلوم ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گُر ایسا بتایا کہ دنیا کی یہ محدود مدت کی زندگی بھی تکلیف میں نہ گزرے اور آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کی راحت ونعمت بھی حاصل رہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مفید رہبری صرف زبانی طور پر کر کے ختم نہیں کردی بلکہ اس کے سکھانے اور بتانے کے لئے آپ ﷺ نے تیس سال عام انسانوں کے ساتھ زندگی گزاری اور ان کو پیش آنے والے سب دکھ سکھ میں شریک رہے اور ان کے سامنے اپنے مالک اور پروردگار کی پسند کا طریقہ بتاتے اور دکھاتے رہے کہ خوشی میں آدمی کو کیسا ہونا چاہئے اور غم کی حالت میں کیسا ہونا چاہئے، دولتمندی میں کیسا ہونا چاہئے اور فقر وفاقہ کی حالت میں کیسا ہونا چاہئے، ان تمام باتوں اور طریقوں کو بتانے بلکہ کر کے دکھانے میں آپ ﷺ نے کم از کم تیئس سال فکرمندی اور برداشت میں گذارے، ایسا کیوں کیا؟ ایسا اس لئے کیا کہ آپ ﷺ کو اپنی امت کی فکر تھی کہ اس کی آخرت بھی اچھی ہو اور دنیا بھی اچھی گذرے، ورنہ آپ ﷺ خدا کے ایسے محبوب بندے تھے کہ خدا ان کی زندگی کو محض راحت ونعمت کی زندگی بنادیتا جس کی بنا پر وہ بہت آرام اور آسودگی کے ساتھ رہتے اور اپنی امت کو صرف وعظ ونصیحت سے نوازتے رہتے لیکن خدا نے یہ چاہا کہ انسانوں کے سامنے اس کی اطاعت وعبادت اور نیک انسانوں کے سامنے اس کی اطاعت وعبادت اور نیک عمل اختیار کرنے کا پورا پورا نمونہ آئے، خواہ اس کے لئے اس کے محبوب بندے کو تکلیف اٹھانا پڑے اور اللہ نے پھر اس نیک بندے کا دل بھی ایسا بنادیا کہ وہ اپنی امت کو ہمیشہ ہمیش کی خوش حالی اور کامیابی دلانے کے لئے اپنے سب آرام وراحت کو چھوڑے ہوئے تھے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس محبوب بندے کی اسی صفت کا حال اس طرح بتایا ہے کہ:

"لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ" (سورہ توبہ۔ ۱۲۸)

''بیشک ایک رسول تم میں سے تمہارے پاس آیا جس کو گوارہ نہیں
کہ تم پریشانی اور تکلیف میں پڑو اور وہ تمہارا بڑا دھیان اور فکر رکھنے
والا ہے اور مسلمانوں کے لئے تو بہت شفقت اور محبت والا ہے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ محبت وشفقت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے افراد سے ہے، اتنی زیادہ تھی کہ اس کے مقابلہ میں ماں باپ کی محبت جو ان کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، کم رہ جاتی ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے مسلمانوں کی محبت اس سے زیادہ ہونا چاہئے جتنی ان کو اپنے باپ اور بیٹے اور سارے کنبہ سے ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو درست اور کامیاب بنانے کے لئے ہر طرح کی فکر مندی اور توجہ سے کام لیا، ایک موقع پر آپ ﷺ نے اس کو اس طرح بتایا کہ ''میرا تمہارا معاملہ ایسا ہے کہ ایک آگ لگی ہو اور تم نادانی میں اس میں کودے جارہے ہو اور میں تم کو پکڑ پکڑ کر اس سے دور کررہا ہوں''، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اپنی راحت کی قربانی اس لئے تھی کہ اپنی امت کو بھی کسی طرح سے اس آگ سے بچالیں جو خدا کے حکموں کی خلاف ورزی کی صورت میں آخرت میں ملے گی اور پھر آپ ﷺ نے صرف اپنی جگہ بیٹھ کر آرام کے ساتھ نہیں کیا بلکہ زبانی بتایا پھر خود کرکے دکھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے سے یہ سب باتیں سامنے آتی ہیں۔

آپ ﷺ کے ایک نواسے کا انتقال ہونے لگا تو آپ ﷺ کی صاحبزادی نے آپ ﷺ کو بلوایا کہ بچہ کا آخری وقت ہے، ذرا آجایئے آپ ﷺ تشریف لے گئے، بچہ گود میں لیا، اس کی جانکنی کی حالت تھی، شفقت بھرے نانا کی آنکھوں میں آنسو آگئے، ایک صحابی موجود تھے، کہنے لگے آپ ﷺ بھی ایسے متاثر ہوتے ہیں، فرمایا کہ میں انسان

ہوں، میرے دل میں بھی محبت ہے اور اتنا بھی نہ ہو تو وہ انسان کیا، اس طرح آپ ﷺ کے خورد سال اور اکلوتے صاحبزادے کی وفات ہوئی، آپ ﷺ تشریف لے گئے اور دیکھ کر فرمایا میری آنکھیں نم ہو رہی ہیں، دل غمزدہ ہے لیکن اپنی زبان سے صرف وہی کہوں گا جس سے میرا رب راضی ہو، اے ابراہیم تمہاری جدائی پر ہم غمزدہ ہیں، اس موقع پر سورج گرہن ہوا لوگ کہنے لگے کہ عظیم القدر نبی کے بیٹے کے انتقال کا یہ اثر معلوم ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ دیکھو یہ سورج، یہ چاند اللہ کے حکم کے تابع ہیں یہ اپنے نظام کے مطابق چلتے ہیں کسی کے مرنے جینے سے ان پر اثر نہیں پڑتا۔ غور کیجئے، کس قدر پرعظمت بات ہے کہ ایسے موقع پر آدمی خوش ہوتا ہے کہ ہماری اور ہمارے بیٹے کی اہمیت سمجھی جا رہی ہے ہمارے کچھ کہے بغیر خود بخود لوگ اہمیت دے رہے ہیں، اچھا ہے کہنے دیا جائے نہیں آپ ﷺ نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ کسی کے عقیدہ میں بال برابر فرق آئے اور وہ خدا کے سوا کسی اور کو آسمان و زمین، سورج چاند پر اثر ڈالنے والا سمجھے۔

یہ غم کے موقع کی مثال تھی، مسرت کے موقع کی بھی مثال دیکھئے کہ آپ ﷺ کے محبوب چچا زاد بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ کی ہجرت سے منتقل ہو کر مدینہ پہنچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مل کر بہت خوش ہوئے، اسی دوران میں مسلمانوں کی فتح کی خوش خبری پہنچی تو ایک طرف مسلمانوں کی خوشی تھی دوسری طرف اپنے محبوب اور اللہ کے لئے قربانی دینے والے مومن بھائی کی آمد کی مسرت تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بتا نہیں سکتا کہ دونوں مسرتوں میں کون مسرت زیادہ ہے، ذرا دیکھئے اس توازن کو اور اعلیٰ کردار کو کہ بحیثیت قائد و امیر، مسرت کا جو موقع تھا اس کا حق ادا کیا اور اسی کے ساتھ عزیزدارانہ و برادرانہ محبت کا جو تقاضا تھا اس کا حق بھی ادا کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے

پدرانہ محبت بے حد تھی جس کا اظہار ہوتا رہتا تھا، لیکن مدینہ میں کسی ایک آدمی پر چوری کا جرم ثابت ہوا، وہ بڑا خاندانی اثر ورسوخ رکھتے تھے کسی نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ سزا تو ملے گی، یہ بات تو ایسی ہے کہ میری عزیز بیٹی فاطمہ سے یہ حرکت سرزد ہو جاتی تو میں اس کا بھی ہاتھ قطع کرواتا، ذرا دیکھئے اس عظمت کو، بات سمجھانے کے لئے ایسی مثال دے دی جس کو زبان سے کہنے میں بھی آدمی پر اثر پڑتا ہے، لیکن حق کی بات ہو تو آپ ﷺ کوئی رعایت نہیں کرتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ کے اوصاف میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ اس قدر نرم دل اور محبت وشفقت والے تھے کہ کسی کو بھی آپ ﷺ کی ذات سے ادنی اذیت نہیں ہوتی تھی، آپ ﷺ نے کبھی کسی چھوٹے کو اور کسی خدمت کرنے والے کو نہیں مارا آپ ﷺ سے مدد مانگنے والا بعض وقت اس قدر پیچھے پڑتا کہ تنگ کر دیتا، بعض وقت یہ تک ہوا کہ آپ ﷺ کے جسم پر آپ کی چادر اس طرح سختی کے ساتھ کھینچی کہ آپ ﷺ کی گردن کی کھال میں رگڑ آگئی لیکن آپ ﷺ نے پھر بھی سخت جواب نہیں دیا، صرف یہی فرمایا کہ اس وقت دینے کو کچھ موجود نہیں، اس لئے معذوری ہے، بعض وقت اصرار کرتے ہوئے آپ کو ڈھکیل دیا گیا کہ آپ ﷺ کانٹوں میں جا پڑے، لیکن آپ ﷺ نے سخت رویہ یا جواب نہیں اختیار کیا لیکن جب حق کا معاملہ آجاتا تو ایسے جوش وغضب میں آجاتے کہ اس کا مقابلہ آسان نہ تھا۔

جب راحت کا موقع ہوتا تو اپنے اصحاب کو آگے رکھتے خطرہ کا موقع ہوتا تو خود آگے بڑھ جاتے، ایک موقع پر رات کی تاریکی میں ایسی آواز آئی کہ جس سے فکر وتشویش پیدا ہوئی، آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ کوئی جا کر دیکھتا کہ کیا ہے؟ لیکن رات کی تاریکی اور اس وقت کی صورت حال دیکھ کر لوگ جھجھکے تو آپ ﷺ نے فرمایا میں جاتا ہوں اور خود تشریف لے جا کر تحقیق وجستجو کر کے واپس تشریف لائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے صلاح وفلاح والی زندگی کو بنانے اور سکھانے کے لئے اپنی زندگی کو کس طرح تنگی اور ترشی سے گزارا اور اس میں کن مشکلات کو گوارہ کیا، آپ کا یہ حال بن گیا تھا کہ خوشی کے موقع پر اپنے اصحاب کو خوش رکھنے کے لئے خوشی کا اظہار فرماتے، ان کی خوشی میں شرکت فرماتے، لیکن آپ ﷺ کا دل امت کے لئے فکر مندی اور آخرت کی کامیابی کے دھیان کی وجہ سے ملول اور ہر وقت فکر مند رہتا تھا اور آپ ﷺ کی دریا دلی اور سخاوت کی وجہ سے آپ ﷺ کے گھر میں دو دو مہینے چولہا نہیں جلتا تھا، آپ ﷺ کے پاس اتنا کم بچتا تھا کہ دو وقت کا کھانا پورا کرنا مشکل ہوتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اپنی امت کے مفاد میں اپنے کو بے چین اور متفکر رکھا اور وہ اس طرح خدا تعالیٰ کے بعد اپنی امت کے سب سے بڑے محسن بن گئے، اس لئے آپ ﷺ سے محبت کرنا ہر کسی دوسرے سے محبت کرنے سے زیادہ ہونا بالکل مناسب اور شریفانہ کردار کی بات ہے اور شریعت اسلامی کی رو سے لازمی اور ضروری بھی ہے، اس کے بغیر کسی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو اپنے لئے مثالی نمونہ بنا کر اس سے اپنی زندگی کو درست کرنے کی کوشش بھی کرنا ضروری ہے، اس میں کوتاہی اسلامی احکامات کی خلاف ورزی شمار ہوتی ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً " تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے اور یہ اس کے لئے ہے جو اللہ سے خیر کی امید کرتا ہو اور آخرت میں کامیابی کی خواہش رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کا بہت ذکر کرتا ہو۔

محبت رسول ﷺ کا تقاضا

اسلام کا کلمہ "لا الـه الا اللّٰہ" کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں بغیر "محمد رسول اللّٰہ" کے مکمل نہیں ہوتا، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے کے ساتھ اس کے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطلب ہے، اللہ رب العزت کی طرف سے وہ جو احکام اور شریعت لائے اس کو ماننا اور اس کے حکموں پر چلنا، اسلام میں حق کا راستہ یہی متعین کیا گیا ہے کہ خدا کو رب واحد مانا جائے اور اس کی طرف سے جو حکم اس کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے اس کو مانا جائے۔

ہر مسلمان کو بتایا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو انہی احکام کا پابند بنائے اور سچا اور صحیح مسلمان بنے، آج مسلمانوں میں جو انحطاط اور کمزوری آ گئی ہے وہ دراصل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام سے ہٹ جانے اور غفلت برتنے سے پیدا ہوئی ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرِ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (سورہ احزاب:۲۱)

"کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے اور یہ

ہر اس شخص کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور آخرت کے دن
کی جواب دہی کی امید رکھتا ہو اور اس نے اللہ کو یاد کیا ہو۔"

اسی طرح ہر مسلمان کی زندگی کے لئے حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور طریقۂ حیات کو نمونہ قرار دیا گیا ہے، جن کی پیروی ہر مسلمان پر واجب ہے ان کی پیروی دراصل اس وقت ہو سکتی ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو ہمارا دل پوری طرح جانتا اور مانتا ہو، ہم کو ان سے سچی محبت ہو، ان کی خوشی ہمارے لیے نعمت کا درجہ رکھتی ہو، اور ان کا رنج ہمارے لیے سوہان روح ہو، ہم ہر وقت یہ فکر رکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا پسند تھا اور کیا ناپسند، آپ ﷺ کس بات سے خوش ہوتے تھے، کس بات سے ناخوش اور یہ کہ آپ کی خوشی کا کام کیسے کر سکتے ہیں۔ اور آپ ﷺ کی ناخوشی کے کام سے کیسے بچ سکتے ہیں، صحابۂ کرام کو جو آپ ﷺ سے محبت تھی اور جو تعلق تھا اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ سے یہ محبت کرا کے قیامت تک ساری امت مسلمہ کو یہ بتا دیا کہ اللہ کے اس آخری اور عظیم رسول ﷺ سے محبت کیسے کی جاتی ہے اس کی خوشی کا کام کیسے کیا جاتا ہے۔

غزوۂ تبوک میں حضرت کعبؓ بن مالک نہیں جا سکے تھے، ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانا تھا، لیکن گھر اور باغ کی فکر میں دیر لگتی چلی گئی، حتیٰ کہ جانے کا وقت نکل گیا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ سے واپس تشریف لائے اور حضرت کعبؓ ان سے ملنے گئے آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کعب تم غزوہ میں نہیں گئے تو حضرت کعبؓ خود بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے مجھ کو بڑے اچھے ڈھنگ سے بات کرنے اور اپنی بات کو اپنے مطلب کے مطابق ڈھالنے کی اچھی صلاحیت دی تھی، لیکن میں نے عرض کیا کہ حضور میں کسی اور کے سامنے ہوتا تو اپنے مطلب کے مطابق ڈھنگ سے بات کر سکتا تھا۔ لیکن آپ ﷺ کے سامنے صرف صحیح صحیح بات عرض کرتا ہوں کہ میں

صرف اپنی کوتاہی کی وجہ سے نہیں گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا انہوں نے سچی بات کہی، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرو اور آپ ﷺ نے تمام لوگوں کو حضرت کعبؓ سے بات کرنے اور ان سے تعلق رکھنے سے منع کر دیا، حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ اتنا ہونا تھا کہ پورا شہر میرے لیے سناٹے کا ہوگیا، وہاں میرے لیے گویا کوئی آبادی نہیں رہی، میرے قریب ترین عزیز اور دوست تک مجھ سے بات کرنے کے اور میری بات کا جواب دینے کے روادار نہ رہے، بیوی تک کا یہ حال ہوا کہ وہ بھی مجھ سے بولنے اور تعلق رکھنے سے گریزاں ہوگئی، اس طرح مجھ پر چالیس دن گزرے کہ مجھ سے نہ کوئی بات کرتا اور نہ کوئی ملتا، میں مسجد میں نماز پڑھنے جاتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوتے میں سلام کرتا، اور غور کرتا کہ لب مبارک میں جنبش ہوئی، میرا اسلام قبول ہوا یا نہیں، میں اسی ادھیڑ بن میں وقت گزارتا رہا، لیکن اطاعت و سپردگی میں فرق نہیں آیا، شام کے بادشاہ نے مجھ کو کہلوایا کہ میرے پاس آجاؤ، میں نے اس کے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا کہ میں کسی بھی حال میں رہوں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا، مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میرا کیا انجام ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہیں اور ان کی وجہ سے سب فدایان رسول بھی ناراض ہیں۔ لیکن مجھے ان کو چھوڑنا نہیں ہے، میرے پروردگار نے مجھ کو جادۂ استقامت پر قائم رکھا، بالآخر میں امتحان میں کامیاب ہوا، اور آسمان سے معافی آئی، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ بڑھ کر مسکراتے ہوئے ملے اور فرمایا کعب تم کو مبارک ہو تمہاری توبہ قبول ہوگئی، یہ تھی صحابہ کرام کی محبت اور اطاعت رسول کہ ایک جنبش لب سے زندگیاں بدل جاتی تھیں اور کیسا ہی سخت امتحان ہو اطاعت و محبت میں فرق نہ آتا تھا۔

حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول تھے اور اللہ تعالیٰ کے محبوب تھے، اللہ تعالیٰ چاہتا تو آپ ﷺ کی دنیاوی زندگی کی راحت کے لئے بھی ہر

طرح کے سامان کردیتا، مکہ کے پہاڑوں کو آپ ﷺ کے لیے سونے کے پہاڑ بنا دیتا، عرب کے صحراؤں کو سبزہ وگل سے بھر دیتا، اور آپ ﷺ کے لئے دنیاوی دولت کے خزانے پیدا کردیتا لیکن ایسا نہیں کیا کیونکہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو قیامت تک تمام امت مسلمہ کے لئے نمونہ بنانا تھا، نمونہ، جو نظر آئے کہ کس حالت میں آدمی کیا کرے، کس صورت حال میں معاملات کو کس طرح انجام دے، اس کے لیے مادی وسائل کی کمی کی حالت کا نمونہ بھی سامنے آتا تھا، تکلیف و پریشانی کا نمونہ بھی سامنے آتا تھا، شادی و غمی کے موقع کے لئے نمونہ سامنے آتا تھا، دوستوں کی دوستی اور دشمنوں کی دشمنی کے مواقع کے نمونے سامنے آتے تھے، چنانچہ ہر نوع کے موقع اور ہر طرح کے معاملات کے نمونے آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں پیدا کئے گئے اور امت اسلامیہ کو حکم ہوا کہ اپنے رسول کو دیکھو، وہ جو کہیں اس کو مانو، جو کریں اس کی نقل کرنے کی کوشش کرو، آپ ﷺ سے عقیدت ومحبت کا یہ معیار بتایا گیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ
و ولدہ والناس اجمعین“

”کہ تمہارا ایمان اس وقت تک درست نہیں جب تک تم مجھ کو اس
سے زیادہ محبوب نہ بناؤ جتنا تم کو اپنے باپ اپنی اولاد اور دنیا کے
سب سے محبوب لوگ ہوسکتے ہوں“

مسلمانوں نے یہ محبت کر کے دکھا بھی دی، حتیٰ کہ کفار تک نے یہ شہادت دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ان سے ایسی محبت کرتے ہیں کہ جس کی کوئی مثال نہیں، اور ایک صحابی سے جن کو دشمن سولی پر چڑھانے جارہے تھے دشمن نے پوچھا کہ ”تمہارے بجائے اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جگہ پر کردیا جائے اور تم بچ جاؤ تو تمہیں منظور ہوگا، انہوں نے جواب دیا کہ میں تو اس کو بھی قبول نہیں کرسکتا کہ میری زندگی بچ

جائے اوراس کے بدلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھے،
چنانچہ وہ شہید کردیئے گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والے کو خدا کی طرف سے جو صلہ ملے گا وہ بھی بہت عظیم صلہ ہے، فرمایا گیا کہ آدمی آخرت میں اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے، یہ حدیث ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے کہ آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت ملنے کی امید بندھتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا یہ صلہ کس قدر قیمتی اور عظیم صلہ ہے کہ آخرت میں جہاں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں، غمگسار نہیں، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ مل جائے، ذرا غور کیجئے اس شخص کی کامیابی اور نعمت کا کوئی ٹھکانہ ہے، دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ اور بڑی سے بڑی دولت کے مالک جب سرگرداں اور حیران و پریشان ہوں گے اور کسی کو کچھ سمجھ میں نہ آتا ہوگا کہ کیا کرے اس کو اللہ کے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ مل جائے، کیسی بڑی نعمت و دولت ہے، لیکن محبت کے سچی اور صحیح ہونے پر ہی اس نعمت کا استحقاق ہوسکے گا، اور سچی اور پکی محبت کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کی خوشی کا کام کیا جائے اور ناخوشی سے بچا جائے، آپ ﷺ کے احکام کی پیروی کی جائے اور زندگیوں کو اس پیمانے میں ڈھالا جائے جو آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے شب و روز کے حالات سے اور تکلیف و راحت میں آپ ﷺ کے طرز و طریقہ سے، عبادات و معاملات میں آپ ﷺ کی سنت سے بنتا ہے۔

آپ ﷺ سے سچی محبت کا یہی معیار ہے کہ دیکھا جائے کہ ہماری زندگی میں آپ ﷺ کے طریقہ و سنت کی پیروی کہاں تک ہے، دعویٰ کرنا آسان ہے محبت و تعلق کا لفظی اور دکھاوے کا اظہار آسان ہے، آدمی جس طرح اپنی بہت سی خواہشوں پر پیسے صرف کردیتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے دعوے اور دکھاوے پر بھی صرف

کر لیتا ہے، روشنی جلسہ جلوس بھی آسان کام ہیں، اس سب میں دل بھی لگتا ہے اور مزہ آتا ہے، لیکن جس میں جی لگتا ہو اور معلوم ہو جائے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کی بات نہیں، آپ ﷺ کا یہ طریقہ نہیں، پھر اس کو آدمی چھوڑ دے اور اس کے مزے سے اپنے کو بچالے یہی وہ مشکل کام ہے جو ہماری زندگی سے نکلتا جا رہا ہے اور جو سنت ہے، جس سے اللہ کے رسول خوش ہوں گے اس کو اختیار کرے خواہ اس میں کوئی مزہ نہ ہو کوئی دکھاوا نہ ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی اور خوشنودی آپ ﷺ کے احکام پر عمل کر دکھانے سے اور آپ ﷺ کی سنت کی پیروی سے ہوگی۔

ہم دیکھیں کہ آپ ﷺ خوشی کے موقعوں پر کیا کرتے تھے، رنج کے موقعوں پر کیا کرتے تھے، اپنے پروردگار کی عبادت اور اس کے احکام کی بجا آوری کیسی کرتے تھے پھر اپنی بیویوں سے کیسے پیش آتے تھے، بچوں کے ساتھ کیسا سلوک تھا ساتھیوں اور رفقاء کا کیسا خیال کرتے تھے، پڑوسیوں کے ساتھ کیا معاملہ تھا، کیسی رحمدلی تھی، کیسا اخلاق تھا، لوگوں کے حقوق کیسے ادا کرتے تھے، غریبوں کی کیسی مدد کرتے تھے، پریشان حال لوگوں کے ساتھ کام آتے تھے، اسراف اور فضول خرچی سے بچتے اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے، وہ اپنے ماننے والوں اور محبت کرنے والوں سے کیسا مطالبہ کرتے تھے، ایک صحابیؓ نے جن سے آپ ﷺ ایک موقع پر بہت خوش ہوئے، عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے آخرت میں اپنی رفاقت کی دعا کیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ سجدوں سے یعنی پروردگار کی خوب عبادت کرنے سے میری مدد کرو، یعنی میری دعا کو تقویت پہنچاؤ، آپ ﷺ نے جھوٹ اور غیبت سے اور دوسروں کی دل آزاری سے بہت سختی سے منع کیا ہے حتیٰ کہ ایک حدیث میں فرمایا کہ قیامت میں ایسا بھی شخص لایا جائے گا جس نے خوب عبادت کی ہوگی لیکن لوگوں کی دل آزاری کی ہوگی، کسی کو مارا ہوگا، کسی پر الزام لگایا ہوگا جب اس کا حساب ہوگا تو جن کی اس نے دل

آزاری کی ہوگی ان کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی حتیٰ کہ اس کا دامن اس کی اپنی نیکیوں سے خالی ہو جائے گا اور اس کو آگ میں جانا پڑے گا۔

ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا ثبوت دینا چاہیے اور آپ ﷺ کے بتائے ہوئے اخلاق اور اتباع سنت کو اختیار کرنا چاہیے،

یہی اس محبت کا حق ہے اور آپ ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کا اور آخرت میں کامیابی کا یہی ذریعہ ہے، آپ ﷺ کی محبت کے اظہار میں ان باتوں سے بھی بچنا چاہیے جس کو آپ ﷺ نے منع کیا ہے، اس میں صرف چمک دمک کے لیے بے تحاشہ روپیہ خرچ کرنا جب کہ اس کو بچا کر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی جاسکتی ہے، جو کہ ماحول کے اندر متعدد پائے جاتے ہیں۔(۱) تقریبات میں بے جا دھوم دھڑ کا اور ایسے طریقے اختیار کرنا جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، ان کے ساتھ اگر محبت رسول کا مظاہرہ کرے تو وہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، اور اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش نہیں کر سکتا ہاں اس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کے لئے ان کے لائے ہوئے دین کو مضبوط کرنا، اچھے اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے، جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں رہ کر بڑی تکلفیں اٹھائیں ہیں، یہی اہم کام ہے، ہم سچی محبت کا ثبوت اس وقت دیں گے کہ ہر موقع پر اور موقع نکال کر اچھی عادتوں اور اچھی باتوں کو پیدا کریں اور پھیلائیں اور سیرت کے جلسوں میں بھی یہ باتیں کہیں۔

---

(۱) جن کی معاشرے میں کمی نہیں ہے۔

صفات نبوی ﷺ

ہر خاص و عام کے لئے قابل عمل

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے صرف ہادی ہی بنا کر نہیں بھیجا بلکہ ان کو انسانیت و شرافت اور زندگی کے لئے صلاح و فلاح اور صفات حسنہ کا نمونہ بھی بنا کر بھیجا، مزید یہ کہ انسانیت کو راہ راست اور معیار اعلیٰ پر لانے کے لئے ایسی کاوش کے ساتھ جس سے انسانوں کو جانوروں جیسی بے مہار زندگی سے نکل کر انسانیت کو خیر و کامیابی کی زندگی میں داخل ہونے کی راہ ملی، اور اس وقت دنیا کی بیشتر خوبیاں اور فائدے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رہنمائی ہی کے نتیجہ میں حاصل ہوئیں، اللہ تعالیٰ نے اسی بنیاد پر ان کو رحمۃ للعالمین کی صفت عطا فرمائی، اور ان کی حیات طیبہ کو انسانی شرافت اور خوبی کا ایسا نمونہ بنایا جس کو اختیار کرنے سے زندگی بھی درست ہوتی ہے، اور پروردگار کی خوشنودی بھی حاصل ہوتی ہے، اور جس کے نتیجہ میں دنیاوی زندگی میں کی جانے والی کوششوں کا صلہ آخرت میں کامیابی کی صورت میں ملے گا۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ

يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً ۝

(سورہ الاحزاب:۲۱)

''کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں اچھا نمونہ ہے یہ اس شخص کے لئے جو اللہ سے امید قائم کرتا ہے اور آخرت میں (اللہ تعالیٰ کی رحمت کی) امید کرتا ہے اور اس نے اللہ کو بہت یاد کیا ہے۔''

اور فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(سورہ آل عمران:۳۱)

''کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

دنیا کی یہ محدود زندگی گزر جانے کے بعد آخرت کی جو لامتناہی زندگی ملے گی اس میں ہمارے اس دنیاوی زندگی کے اعمال و افعال، وہاں جزا و سزا کے فیصلے کے لئے تولے جائیں گے، ان میں وزن اللہ کے حکم کی تعمیل کا دیکھا جائے گا، اور اس کے حکموں کی تعمیل اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں کی اتباع کے لحاظ سے سمجھی جائے گی، ہماری زندگی، ہمارے اعمال، ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے جس قدر قریب یا مطابق ہوں گے اسی کے بقدر وہ ہم کو آخرت میں کامیابی اور راحت دلائیں گے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان کے اعمال و اخلاق کو اپنی زندگی کے لئے نمونہ بنانا ہی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اطاعت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، اور کسی سے محبت سچی اسی وقت مانی جاتی ہے جب محبوب کی ہر بات اچھی لگتی ہو اور محبت کرنے والا اس کی نقل کی کوشش کرتا ہو، ورنہ وہ محبت محض دعوائے محبت قرار پاتی ہے، جس

کو سچا نہیں سمجھا جاتا۔

ہم مسلمانوں کو اپنی اپنی زندگی کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعی محبت کرتے ہیں یا ہم کو شیطان دھوکہ دے رہا ہے، اور شیطان ایسا کرتا ہے کہ وہ انسان کے نفس کے اندر گھس کر اس کو بہکاتا ہے اور انسان کا نفس جب بہک جاتا ہے تو انسان کا سارا عمل بہک جاتا ہے، خواہ اس کو یہ دھوکہ دیا گیا ہو کہ تمہارا عمل نہیں بہکا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی زندگی کو مختلف حالات سے گزروایا ہے غربت سے، امارت سے، دوستیوں سے، دشمنیوں سے، جنگ کے حالات سے، مسرت کے حالات سے، غم کے حالات سے، خوشی کے حالات سے، اولاد کے پیدا ہونے کی مسرت سے، اور اولاد کے انتقال کر جانے کے رنج سے، ایسے حالات سے جن سے شکر گذاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ایسے حالات سے جن میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے، غصہ دلانے والے حالات سے جن میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر اللہ کے حکم اور رضا کے مخالف معاملہ ہوتا تو غصہ کرتے اور اگر محض اپنی ذات کی بات ہوتی تو صبر و تحمل سے کام لے کر نظر انداز کر دیتے تھے۔

آپ ﷺ کی صفات طیبہ کا ذکر کرنے والے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی کو مارا نہیں نہ گھر کے کسی فرد کو نہ کسی خادم کو، آپ ﷺ کسی پر غصہ نہ کرتے تھے، ہاں اگر حق کے خلاف کوئی بات کی جاتی تو آپ ﷺ کو بے حد غصہ آجاتا، مجلس میں آتے تو کسی کو ہٹاتے نہیں اور نہ بیچ میں گھس کر بیٹھتے بلکہ جہاں جگہ ہوتی وہیں بیٹھ جاتے، یہ بات الگ تھی کہ پھر وہی جگہ مجلس کی مرکزی جگہ بن جاتی، ملاقاتی اگر دور سے آیا ہوتا اور اجنبی ہوتا تو اس کی بات صبر کے ساتھ سنتے اور پوری بات کرنے دیتے اور ہمدردی کا جواب دیتے، کبھی کوئی سائل اس طرح مانگتا کہ پریشان کر دیتا لیکن آپ ﷺ صرف نرم

بات کہتے کہ اس وقت ہمارے پاس کچھ دینے کو نہیں ہے اگر ہوتا تو دے دیتے، اور اگر آپ ﷺ کے پاس ہوتا تو مانگنے والے کو اپنی بڑی سے بڑی چیز دے دیتے اور فرماتے کہ میں بخیل نہیں ہوں۔

ہر وقت اپنے پروردگار کی ناراضی سے ڈرتے رہتے، ذرا تیز ہوا چلتی تو ڈرتے کہ کہیں اللہ کی پکڑ یا عذاب تو نہیں، فوراً استغفار کرتے، نماز پڑھتے اور اللہ کی رضا چاہتے، اللہ کی عبادت میں رات کا بڑا حصہ گزار دیتے کہ پیروں میں ورم ہو جاتا، اور جب کہنے والا کہتا کہ آپ اتنی مشقت کیوں کرتے ہیں آپ ﷺ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہیں تو فرماتے کہ کیا میں اپنے پروردگار کا شکر گذار بندہ نہ بنوں، اس طرح ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نرم گرم ہر طرح کے حالات کا سامنا کیا اور ایمان والوں کے لئے صبر و شکر کا بہترین نمونہ پیش کر دیا، عبادت میں اور اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے میں اعلیٰ معیار قائم کر دیا، انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور حُسنِ اخلاق کا شاندار نبوی اسوہ قائم کر دیا۔

اور ہم سب انسانوں کو ہمارے پروردگار نے حکم دیا کہ اس عظیم اور رحمۃ للعالمین رسول ﷺ کی پوری پیروی کریں کہ اس میں ہماری کامیابی اور نجات ہے، اور ہم کو اس کا حساب آخرت میں اپنے پروردگار کے سامنے دینا ہے اس کے لئے ہماری اسی دنیا کی زندگی کو ہمارے لئے میدان عمل بتایا گیا ہے، اسی میں ہم کو اپنے عمل سے ثابت کرنا ہے کہ ہم کو اپنے پروردگار سے محبت ہے یا نہیں، ہم اس کی رضا چاہتے ہیں یا نہیں، اور جبکہ اس کے لئے اس کے آخری رسول محمد ﷺ کی پیروی کو ضروری قرار دیا گیا ہے، تو ہم کو آخرت میں کامیابی اور اپنے پروردگار کی رضا اسی کے بقدر ملے گی جس قدر ہم اپنے رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں گے اور ان کے اسوۂ طیبہ کی نقل کریں گے اور ان سے محبت کا صحیح ثبوت دیں گے۔ (اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، آمین)

تعلق رسول اور اتباع کامل

رسول اکرم خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کو کہیں قرآن مجید میں ''ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ'' فرمایا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی اس کی فرمائی ہوئی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور دانائی کی باتیں بتاتے ہیں اور اخلاق کی درستگی سکھاتے ہیں، اور کہیں فرمایا گیا، کہ ''اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ'' کہا آپ ﷺ عظیم اخلاق و کردار کے حامل ہیں اور کہیں فرمایا گیا ''لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُو اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا'' کہ تمہارے لئے اللہ کے رسول ﷺ میں اچھا نمونہ ہے، یہ اس کے لئے ہے جو اللہ سے امید کرتا ہو اور آخرت کے دن سے امید رکھتا ہو اور جس نے اللہ کو بہت یاد کیا ہو''۔

الغرض یہ کہ مومن کے لئے اللہ کے آخری اور برگزیدہ رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روشنی کا مینار ہیں، اپنی زندگی کے لئے اُن سے روشنی حاصل کرنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا اور زندگی کے کردار اور اخلاق وصفات میں ان کو اپنے لئے نمونہ بنانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اس لئے کہ اسی میں صلاح وفلاح ہے اور یہی مردِ مومن کا وظیفہ

وطریقہ ہے اور جس نے اس وطیرہ اور طریقہ سے انحراف کیا یا تغافل برتا وہ صحیح راستہ سے دور ہوا، اور اس کی زندگی جادۂ مستقیم سے ہٹ گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوہ سمجھنے اور ان کی پیروی کرنے کے لئے دو اہم شرطیں ہیں، ایک تو یہ کہ آپ ﷺ سے وفادارانہ اور محبانہ تعلق ہو اور وہ ایسا ہو کہ اس ذات عظیم پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہو، صرف زبان سے محبت کا اظہار نہ ہو، بلکہ وہ حقیقت ہو، اور اس میں اخلاص ہو، جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تھا کہ اسلام کی وفاداری کی سزا میں قتل کئے جارہے ہیں اور ان سے پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ بتاؤ کیا تم اس کو قبول کروگے کہ تمہاری جگہ اس وقت تمہارے نبی محمد ﷺ ہوں اور تم بچ جاؤ۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ میں تو اس کے لئے بھی تیار نہیں کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک میں کانٹا چبھے اور میں اس کے عوض میں موت سے بچ جاؤں۔ حضرت حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ اپنے ایک مدحیہ شعر میں کہتے ہیں۔

انّ ابی ووالدہ وعرضی

لعرض محمد منکم وقاءُ

"کہ میرے باپ اور دادا اور خود میری عزت وآبرو سب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کی حفاظت کے لئے نشانہ اور ڈھال ہے"

ایک جنگ سے واپس آنے والوں سے ایک خاتون پوچھتی ہیں کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں، جواب دینے والا کہتا ہے مگر تمہارے والد شہید ہوگئے، وہ پوچھتی ہیں کہ، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں، وہ جواب دیتے ہیں کہ تمہارے شوہر بھی کام آگئے، وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بتاؤ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیرت سے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں، وہ کہتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے رہیں تو ہر مصیبت کمتر ہے" اگر مومن میں

ایسی یا اسی سے قریب تر محبت نہ ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی اور مخلصانہ پیروی، تابعداری اور وفاداری نہیں ہوسکتی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ یعنی اخلاق وصفات، بندگانِ خدا سے آپ ﷺ کی ہمدردی، آپ ﷺ کا حسن معاملہ، بُرا چاہنے والوں کے ساتھ آپ ﷺ کا سلوک، رضائے الٰہی کی طلب، آخرت کی فکر، ہر ایک کے لئے ہمدردی اور خیر طلبی، دنیا ودین میں اس کی کامیابی کی فکر اس کے صلاح وفلاح کا خیال، یہ سب جاننے کی کوشش کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ آپ ﷺ انسانوں کے ساتھ اخلاق ومحبت کا کیا برتاؤ کرتے تھے، اپنے اہل وعیال کے ساتھ کیسی شفقت کرتے تھے، غیروں اور دوسروں کے ساتھ کیسی ملاطفت وہمدردی کرتے تھے، لوگوں کی دینی اصلاح اور ان میں خدا طلبی کا جذبہ کس طرح پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، آپ ﷺ پروردگار کی رضا کے حصول اور اس کی ناراضگی کے کاموں سے بچنے کے لئے کیسی تربیت وتلقین کرتے تھے۔

یہ دو شرطیں ہیں جن کے ذریعہ ایک مومن کو اپنی زندگی سنوارنا، اور اپنے ایمان کو سچا بنانا ہوتا ہے، یہ شرطیں پوری ہوں تو مقصد حاصل ہوتا ہے، اور یہ شرطیں نہ پوری ہوں تو مقصد حاصل نہیں ہوتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ معلوم کرکے اس کی پیروی نہ کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تابعدار ہیں جوڑ نہیں کھاتا۔

بعض وقت آدمی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت ہے، لیکن آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو جاننے کی کوئی فکر نہیں کرتا اور سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے حاصل ہونے والے اخلاق وصفات کو اپنانے کی کوشش نہیں کرتا، ایسے آدمی کا دعویٰ کیسے سچا مانا جائے گا۔

اسوۂ رسول ﷺ اور ہمارا فرض

تاریخ انسانی کے طویل سلسلے کے مطالعے اور جائزے کے بعد یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہی تمام انسان کے لئے (بلا تخصیص زمان ومکان) اسوۂ حسنہ اور کامل وجامع نمونہ ہے، جس کی اتباع وتقلید اور اس سے استفادہ وفیضیابی ہی افراد کی تعمیر سیرت، کردار سازی اور اقوام وملل کی دینی ودنیوی صلاح وفلاح کی تنہا ضامن، مسائل حیات اور زندگی کی گوناگوں مشکلات کا واحد حل، قیام امن ومساوات کا واحد لائحۂ عمل، اخلاقی وروحانی سیاسی ومعاشرتی، اقتصادی وتمدنی ترقی کا کامیاب ذریعہ ووسیلہ اور مجموعی طور پر بہترین نظام زندگی، کامل دستورِ حیات اور انسانیت کے لئے ''سفینۂ نجات'' ہے۔

سیرت نبوی ﷺ کی اس اہمیت، ضرورت اور افادیت کے پیشِ نظر مسلمان اور غیر مسلم مؤرخین کے قلم سے دنیا کی ہر بڑی زبان میں سیرت کے مستقل ذخیرے اور کتب خانے تیار ہوچکے ہیں، مگر اپنے اپنے عہد کے لحاظ سے اس چشمۂ صافی اور اس گنج بے بہا سے گوناگوں استفادہ کی ضرورت برابر قائم ہے، بلکہ عصری مسائل اور دورِ حاضر کی مشکلات کے حل کے لئے سیرت نبوی ﷺ سے مراجعت، پہلے سے کہیں زیادہ ناگزیر ہے کہ سیرت کی کاملیت وجامعیت اور اس کی عالمگیری وابدیت کا یہ

لازمی تقاضا ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است
خم وخمخانہ بامہر ونشاں است

اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری انسانیت کے لئے قابل تقلید نمونہ بنا کر بھیجا اور سارے انسانوں کو اس بات کی تاکید کی کہ اپنے پروردگار کی رضا حاصل کرنے کے لئے اس کے رحمۃ للعالمین نبی کو اپنی زندگیوں کے لئے نمونہ سمجھیں، اور اپنے عمل کو اسی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کے اعمال وافعال کو عقیدۂ توحید کے ساتھ اسی کوشش کی بنیاد پر قبول کرے گا یا رد کرے گا۔

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے آخری نبی ورسول اور پھر تمام نبیوں ورسولوں کا سردار بنا کر تمام لوگوں کی جانب اور سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا، اور رحمت کسی ایک آدمی یا کسی ایک شہر وملک کے لئے نہیں بلکہ ساری انسانیت اور سارے جہانوں کے لئے، گزشتہ انبیاء علیہم السلام نے آپ ﷺ کی بشارت سنائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ارشاد ہوا:

”یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ (سورۂ صف:٦)

”اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، اور جو کتاب محمد ﷺ سے پہلے آچکی ہے، (یعنی) تورات میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت سناتا ہوں۔“

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات والا صفات کو جامع کمالات بنایا رسالت کے مختلف پہلو، قیادت کے نوع بہ نوع خصائص اور بلند انسانی اخلاق آپ ﷺ کی ذات میں جمع تھے، آپ ﷺ کی شریعت ہمہ گیر تھی، اور آپ ﷺ سیاسی اور فوجی قیادت کی بھی اعلیٰ صلاحیت کے حامل تھے، وسیع پیمانہ پر ایک علمی وفکری بیداری آپ ﷺ نے پیدا کی، انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے نہایت مضبور بنیادوں پر آپ ﷺ نے اسلامی زندگی کی تعمیر فرمائی، آپ ﷺ کی ذات سے انسانی تاریخ کے ایک نہایت زریں وروشن باب کا آغاز ہوا، ایسا باب جیسا اس سے قبل دیکھنے میں نہ آیا تھا، جہاں دین بھی تھا اور دنیا بھی تھی، اخلاق بھی تھے اور سیاست بھی تھی، دعوت بھی تھی اور عمل بھی تھا، جہاں انسانیت کی خدمت بھی تھی، اور حق کا دفاع بھی، مسلح جہاد اور نمرد آزمائی کے طریقے بھی تھے، اور صلح کی زندگی بھی، تاریخ انسانی نے اس ذات والا صفات سے جس دور کا آغاز کیا وہ اس اعتبار سے تاریخ کا بڑا عظیم الشان دور تھا، کہ یہ انسان کی دینی، وفکری قائدانہ زندگی پر محیط تھا، اور آپ ﷺ کی پاکیزہ شریعت حیاتِ انسانی کے مختلف گوشوں پر سایہ فگن تھی، اس شریعت میں تمام انسانی طبقات، گروہوں اور عناصر کو ایک لڑی میں پرو دیا اور ان سب کو ایک جادہ کا مسافر بنادیا، وہ جادۂ فضیلت، حق اور خیر تھا، آپ ﷺ سے یہ صاف صاف کہہ دینے کہ کہہ دیا گیا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ (یوسف:۱۰۸)

''میرا راستہ تو یہ ہے میں خدا کی طرف بلاتا ہوں، (از روئے یقین وبرہان)''

اور یہ وضاحت کر دینے کو فرما دیا گیا کہ:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔

"کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم
سے محبت کرے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔"

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت انسان کے اخلاق واعمال کو اپنی زندگی کے لئے نمونہ بناتی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان کے اعمال اور اخلاق کو اپنی زندگی کے لئے نمونہ بنانا ہی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اطاعت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، کسی سے محبت سچی اسی وقت مانی جاتی ہے جب محبوب کی ہر بات اچھی لگتی ہو اور محبت کرنے والا اس کی نقل کی کوشش کرتا ہے ورنہ وہ محبت محض دعوائے محبت قرار پاتی ہے جس کو سچا نہیں سمجھا جاتا۔

نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ شریعت اسلامی کا اہم ماخذ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان کی زندگی کے لئے واجب التقلید نمونہ ہے، اس سے ایک طرف شریعت کے بہت سے احکام وہدایات ملتے ہیں، دوسری طرف اسی سے ہم کو اسلامی زندگی کا مثالی نمونہ ملتا ہے۔ اس حیات طیبہ کو سن کر اور پڑھ کر مسلمان کا دل ودماغ جو کچھ اخذ کرتا ہے اس سے اس کی دنیا بھی بنتی ہے اور دین بھی بنتا ہے آپ ﷺ نے جو فرمایا اور آپ ﷺ نے جو کیا اور آپ ﷺ نے جو دیکھا اور ہونے دیا، اس سب کو حدیث کا نام دیا جاتا ہے، اور حدیث شریعت اسلامی کا ایک بہت بڑا ستون ہے، لہٰذا مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا جی لگا کے مطالعہ کرے، اپنے جلسوں میں، تقریروں میں، گفتگوؤں میں اس کی باتوں کا چرچا کرے ان باتوں سے سبق لے اور ان کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرے جن کو مستند کتابوں میں نقل کیا گیا ہے اور جن کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے خواہ وہ زندگی دین کے معاملات کی ہو، خواہ دنیا کے معاملات کی، لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اس کی طرف بہت کم ہے، ربیع الاول آتا ہے، سیرت النبیؐ کے جلسوں کی رونق آجاتی ہے، یہ جلسے بہت مبارک ہیں اور ضرور کرنا چاہئیں، لیکن اس

بات کی فکر بھی بہت ضروری ہے کہ ان جلسوں سے صحیح فائدہ اٹھایا جائے، شرکت کرنے والوں کی اخلاقیات درست ہوں اور وہ ان سے سیکھیں اور نصیحت حاصل کریں، اس سلسلہ میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کتنے لوگوں کی زندگیوں میں ان کے سننے اور جاننے سے تبدیلی آئی، کتنے لوگوں کی زندگی شریعت اسلامی کے سانچے میں ڈھلی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر اس کا مطلب ہے کہ جلسہ کرنے والوں میں کوئی نہ کوئی بے خیالی ہے کہ جو فائدہ حاصل کر سکتے تھے وہ حاصل نہ کر سکے اور اس مقصد کو پورا نہ کر سکے جس مقصد کے نام پر یہ جلسے کئے جاتے ہیں، وہ صرف معجزات یا ایسے کمالات کے بیان میں محدود ہو کر رہ گئے جن پر آپ ﷺ کے امتیوں کا عمل ممکن نہیں یا بہت ہی مشکل ہے دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ نہ مقررین اس کا خیال کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے نصیحت آمیز پہلوؤں کو بیان کریں اور نہ سامعین کو اس کا شوق کہ وہ باتیں سنیں جن سے ان کو سبق ملتا ہو، ہاں چمک دمک، ذوق و پسند کی باتیں، خوش کن جلسہ تو ہو جاتا ہے، لیکن اس سے فائدہ پہنچنے کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اگر اس سب میں حیات طیبہ مبارکہ کی عملی روح بیان کی جاتی اور حیات طیبہ کا مقصد چمکتا نظر آتا تو زندگیوں کو روشن کر دیتا اور اعمال کی اصلاح کر دیتا جس کی اس وقت امت کو بہت ضرورت ہے اور امت اس سے بہت ہٹ گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کے محبوب اور عظیم المرتبت نبی تھے تو آپ ﷺ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ناز و نعم میں زندگی گزارتے اور آرام و راحت کے ساتھ اپنی نبوت کی ذمہ داری پوری کرتے، شان و شوکت بھی نظر آتی، عظمت و قوت بھی خوب ظاہر ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آپ ﷺ نے غربت جیسی اور سادہ طرز کی زندگی گزاری، نہ اس میں دولت مندی کا اظہار تھا اور نہ شان و عظمت کا دکھاوا، بلکہ

واقعہ تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کو زندگی کی بہت صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، مصیبتیں جھیلنا پڑیں، اور یہ سب دعوت حق کو عام کرنے کے لئے، اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے، انسانوں کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کرنے کے لئے اور اپنی امت کو زندگی کے رضائے الٰہی والے طریقوں کو بتانے کے لئے گوارا کرنا پڑا، خود تکلیف اٹھاتے دوسروں کو آرام پہنچاتے، غریبوں کی مدد کرتے، سب کے ساتھ برابری اور اخلاق کے ساتھ پیش آتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں جب تشریف لائے تو پیدا ہونے سے قبل اور پیدا ہونے کے چند سال بعد والد والدہ کی شفقتوں سے محرومی برداشت کرنی پڑی، ذرا بڑے ہوئے تو شفیق دادا بھی نہ رہے، صرف چچا کی ہمدردی و شفقت باقی رہی، لیکن چچا کو غربت کا سامنا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ کو بھی غربت کا سامنا کرنا ہوا، یتیمی پھر غربت دوہری دشواری، آپ ﷺ کچھ بڑے ہوئے تو معاشی لحاظ سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تدبیر کی آپ ﷺ نے اپنے قبیلہ کے دستور کے مطابق کاروبار وتجارت کی طرف توجہ دی، آپ ﷺ کی دیانت وامانت اثر لائی اور کاروبار کے ذریعہ آپ ﷺ کے اقتصادی حالات میں تبدیلی آئی، اس سے آپ ﷺ نے شفیق چچا کی مدد بھی کی، اور وہ اس طرح کہ ان کے ایک صاحبزادہ کو آپ ﷺ نے اپنی کفالت میں لے کر ان کے بوجھ کو ہلکا کیا، دوسری طرف قوم کے سامنے آپ ﷺ کے جو اعلیٰ انسانی اخلاق وکردار آئے ان سے آپ ﷺ کو سب کی محبت و قدر حاصل ہوئی، آپ ﷺ کا نام سب نے امانت دار رکھ دیا اور آپ ﷺ سب کی آنکھوں کا تارہ بن گئے، ہر ایک بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا اور تعریف کرنے لگا کہ اتنے میں نبوت کی ذمہ داری ملی اور اس کا کام سپرد ہوا، اس کام کے کرنے سے لوگوں کا سابق رویہ بدل گیا آپ ﷺ کے درپے آزار بن گئے، اگر پہلے جیسے

رہتے تو قریش میں آپ سے زیادہ پسندیدہ اور محترم شخص کوئی اور نہ ہوتا، آپ ﷺ قریش کے بادشاہ کی طرح ہو جاتے اور آپ ﷺ کو دنیاوی وجاہت انتہا درجہ کی حاصل ہوتی، آپ ﷺ جو کہتے قریش اس کو بجالاتے، آپ ﷺ کے لئے سب اپنی نگاہیں فرش راہ کرتے، لیکن خدا کو آپ ﷺ سے دعوت واصلاح کا کام لینا تھا آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ قوم کے عقیدوں اور مذہبی عادتوں کی جو بگڑی ہوئی شکلیں چل رہی تھیں ان کی اصلاح کا پیغام سنائیں، آپ ﷺ نے رسالت کی ذمہ داری اٹھالی اور اس کی انجام دہی سے جو تکلیفوں کا سلسلہ شروع ہونا تھا اس کے لئے تیار ہو گئے آپ ﷺ کو آرام مطلوب نہ تھا آپ ﷺ کو انسانوں کی خیر خواہی مطلوب تھی، چنانچہ عداوت کا جو طوفان اٹھا وہ زبردست تھا، آپ ﷺ کو امانت دار اور نیک کردار کہنے والے اور عزت واحترام سے پکارنے والے بگڑ گئے، پہلے جو تعریف کرتے تھے اب برائی کرنے لگے، پہلے آنکھوں میں بٹھانے کے لئے تیار رہتے تھے، اب پتھر مارنے لگے، عزت کرنے والے مذاق اڑانے لگے، گندگی اور کیچڑ ڈالنے لگے، آپ ﷺ نے یہ سب جھیلا اور پیغام خداوندی سناتے رہے، حق وانسانیت کے لئے حکم الٰہی کی بجا آوری کے لئے سب برداشت کرتے، جواب نہ دیتے، صبر آزما معاملہ تھا، لیکن آپ ﷺ نے عظیم صبر سے کام لیا، برداشت سے باہر تھا، پھر بھی برداشت کیا، کیونکہ حکم الٰہی تھا کہ برداشت کرو، جواب نہ دو، مخالفت کے باوجود نیکی کی تلقین کرتے اور حق کا پیغام پہنچاتے رہے، ۱۳ سال اسی جدوجہد اور صبر میں گزرے، اور برداشت اور صبر کا حکم جاری رہا، حتیٰ کہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا، بالآخر خدا کی طرف سے اجازت ملی کہ بہت ظلم ہو چکا اب جواب دے سکتے ہو، اب مقابلہ پڑے تو مقابلہ کر سکتے ہو، اللہ کی مدد ہوگی، یہاں سے مقابلہ کا آغاز ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی جو مدد تکلیف جھیلنے اور برداشت کرنے میں آتی تھی وہ مقابلہ کی اجازت

کے بعد جاری رہی اور میدان جنگ میں آئی آپ ﷺ پر دشمن حملہ آور ہوتا، آپ ﷺ کے نئے وطن مدینہ پر چڑھائی کرتا، آپ ﷺ مقابلہ کرتے اور بہادری کا ثبوت دیتے، یہ سب حق کے لئے تھا اپنے پروردگار کی رضا کے حصول کے لئے تھا، نفس کشی تھی، راحت کی قربانی تھی، مکہ کی ۱۳ سالہ مدت میں بھی قربانی اور مدینہ کی ۱۰ سالہ مدت میں بھی خطرات کا مقابلہ اور قربانی، اعلیٰ اور پاکیزہ زندگی، انسانیت، رواداری، برداشت، ثابت قدمی، بہادری، شرافت وعظمت، کردار کے طرح طرح کے انداز، یہ تھی انسانیت نواز مثالی زندگی، آپ ﷺ کی ایک ایک ادا، ایک ایک گوشہ آپ ﷺ کی امت کے لئے رہنما اصول تھا، نمونہ کا کردار تھا اور وہ انسانی زندگی کے متنوع ومختلف پہلوؤں پر مشتمل تھا، آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ ایک نہایت ہمدرد اور انس ومحبت رکھنے والے رفیق تھے، عام انسانوں کے لئے غمگسار اور انسانیت نواز انسان تھے، کمزوروں، غریبوں کی مدد کرنے والے، چھوٹوں پر شفیق، بڑی عمر والوں کی عمر کا خیال کرنے والے، گھر کے اندر گھر کے ایک عام فرد، اپنے اصحاب ورفقاء میں ان کے احساسات وجذبات کا خیال رکھنے والے تھے، آپ ﷺ کی تعلیم تھی چھوٹے اور بڑے دونوں ایک جگہ ہوں، تو بڑے کے بڑا ہونے کا خیال کرو، بچوں کے ساتھ شفقت ورعایت کا یہ حال تھا کہ ایک بچہ ابو عمیر تھا اس کے پاس ایک چڑیا تھی جو مرگئی تھی، آپ ﷺ اس سے ملے تو اس سے ہمدردانہ طریقہ سے پوچھا اے ابوعمیر! تمہارا پرندہ نغیر کیا ہوا؟ ''یا أبا عمیر ما فعل النُّغَیرُ'' آپ ﷺ کو کوئی بوڑھی عورت راستہ میں روک لیتی اور اپنی بات کہتی رہتی آپ ﷺ سنتے رہتے اور اس کا دل چھوٹا نہ کرتے، آپ اپنے رفقاء کے ساتھ ہوتے تو ان سے انس ودلچسپی کی بات کرتے، ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت نے آپ سے جنت میں جانے کی دعا کی درخواست کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی، وہ روتی

ہوئی لوٹنے لگی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے کہہ دو کہ جنت میں بڑھاپے کی حالت میں نہیں داخل ہوگی۔ ایک شخص نے آپ ﷺ سے اپنی ضرورت کے لئے اونٹ مانگا، آپ ﷺ نے از راہ مزاح فرمایا کہ تمہیں اونٹ کا بچہ دوں گا، وہ کہنے لگا یا رسول اللہ بچہ سے میرا کام نہ چلے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ہر اونٹ اونٹ کا بچہ ہی تو ہوتا ہے ایک مرتبہ رات کا وقت تھا اور کوئی خطرناک آواز آئی جیسے کوئی دشمن ہو یا خوفناک جانور، آپ ﷺ نے تحقیق کے لئے اپنے رفقاء کی طرف دیکھا وہ کچھ ڈرے سے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں خود جا کر دیکھتا ہوں اور آپ ﷺ نے کسی پر دباؤ نہیں ڈالا خود جا کر دیکھا اور تحقیق کر کے تشریف لائے۔

اسلام میں ضرورت محسوس ہونے پر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، جو عام مسلمانوں کے لئے چار کے اندر محدود رکھی گئی ہے البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ کی اجازت دی گئی لیکن آپ ﷺ نے عنفوان شباب کا سارا زمانہ صرف ایک بیوی کے ساتھ گزارا اور وہ بھی آپ ﷺ سے عمر میں بڑی تھیں، بعد میں نبوت کے کام کے ساتھ حکومت و سیاست، صلح و جنگ اور دیگر معاملات کی ذمہ داریاں آپ ﷺ کی بہت بڑھ گئیں، اس وقت آپ ﷺ نے کئی بیویوں کی اجازت سے فائدہ اٹھایا اور اس اجازت سے آپ ﷺ نے بہت سی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں بھی مدد لی، آپ ﷺ نے اس کے ذریعہ یہ بھی دکھایا کہ اسلام میں ذات پات، سماجی پوزیشن اور رواجی عادتوں کے فرق کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات میں اپنے معزز خاندان کی اور دیگر خاندانوں کی بھی بیویاں شامل کیں، آپ ﷺ نے نومسلم خاتون کو بھی داخل زوجیت کیا، باندی بن کر آنے والی خاتون کو بھی آزاد کر کے داخل زوجیت کیا، اپنے متبنّٰی کی مطلقہ کو بھی شامل کیا جو کہ عرب کے معاشرے میں

غلط سمجھا جاتا تھا لیکن خدا کا حکم آیا کہ متبنّٰی کو بیٹے کی طرح نہ سمجھا جائے اور اس کو بیٹے کے حقوق بھی نہ دیئے جائیں، چنانچہ آپ ﷺ نے عرب معاشرے کے متبنّٰی کے غلط رواج کو توڑا آپ ﷺ نے ایسی شادیاں بھی کیں جن میں تعلق والوں کی دلداری مقصود تھی، ایسی بھی شادی کی جس سے غلط رواج کو باطل کرنا تھا، ایسی بھی کی جس میں دوسروں کی خدمات و تعلق کا صلہ تھا، پھر ان سب کے درمیان ایسا انصاف اور برابری کا برتاؤ کیا کہ جو اپنی نظیر آپ ہے، اپنی پسند کو باعث ترجیح نہیں بنایا، مدینہ منورہ میں فدک و خیبر میں آپ کو کچھ جائداد حاصل ہوگئی تھی، فصل پر اس کا غلہ آتا تو آپ ﷺ وہ برابر اپنی تمام ازواج مطہرات میں تقسیم کرکے ہر ایک کو اس کے حصہ کا مالک بنادیتے تھے، آپ ﷺ اپنے دنوں اور راتوں کو ازواج مطہرات میں برابری کے ساتھ تقسیم کرتے تھے اور اس میں ہر ایک کا حق پورا ادا کرتے تھے اور جب آپ کا آخری مرض ہوا تو بیماری کے تقاضہ سے آپ ﷺ نے ایک ہی گھر میں رہ کر علاج کرانا مناسب سمجھا، لیکن آپ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات سے اس کی اجازت لی، جب اجازت مل گئی تب آپ ﷺ نے اس پر عمل کیا، جب آپ سفروں میں جاتے تو کسی ایک بیوی کو ساتھ لے جاتے اور ایسے میں خود اپنی مرضی و پسند سے انتخاب نہ کرتے بلکہ قرعہ ڈالتے، جس کا نام نکلتا اس کو لے جاتے آپ ﷺ اپنے اہل خانہ کے لئے اس طرح اخلاق و محبت کا برتاؤ کرتے، جیسا شوہر کو بیوی کے ساتھ کرنا چاہئے، نبی ہونے کی بنا پر اس سے برتری کے طرز پر معاملہ نہ کرتے، بیوی کے انس و خوشی کا لحاظ رکھتے، ایک مرتبہ کچھ حبشی جنگجو اپنے ملک کے جنگی کرتب آپ ﷺ کے مکان کے سامنے دکھا رہے تھے آپ ﷺ نے اپنی اہلیہ کو بھی دکھایا، بلکہ دروازہ پر کھڑے ہوکر آڑ بنادی اور اپنے کاندھے کے بیچ سے ان کو دیکھنے کا موقع دیا، آپ ﷺ ایک بار بچوں کو پیار کررہے تھے، ایک صحابی کو تعجب ہوا کہ آپ ﷺ نبی

جیسے باوقار منصب پر ہونے کے باوجود یہ عام لوگوں جیسا معاملہ کر رہے ہیں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ رحم وشفقت کا جذبہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں رکھا ہے اس کو دبانا نہ چاہیئے، آپ ﷺ کے ایک نواسہ کا انتقال ہوا تھا جو بچہ تھا، آپ ﷺ کی صاحبزادی نے آپ ﷺ کو بلوایا، آپ ﷺ تشریف لائے بچہ کو گود میں لیا، آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، خود آپ کے صاحبزادہ کا بھی انتقال ہوا آپ ﷺ نے اپنے جذبات غم کو اپنے آنسو سے ظاہر کیا اور فرمایا کہ میرا دل بڑا غمزدہ ہوا، مسرت کے موقع پر مسرت کا بھی اظہار ہوتا تھا، ایک غزوہ میں فتح کے موقع پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے اور آپ ﷺ کو ان سے تعلق بھی بہت تھا، ہجرت حبشہ میں ایک عرصہ رہنے کے بعد آئے تو آپ ﷺ نے مسرت کیفیت کے ساتھ فرمایا کہ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ مجھے اس جنگ میں فتح سے خوشی زیادہ ہوئی یا جعفر رضی اللہ عنہ کے آنے سے خوشی زیادہ ہوئی۔

آپ ﷺ اپنے رشتہ داروں سے محبت کے ساتھ ساتھ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ بھی ہمدردی اور محبت اور رواداری کا برتاؤ فرماتے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی پر غصہ نہ کرتے، خواہ آپ ﷺ کا کیسا ہی نقصان ہو اور اذیت پہنچے، آپ ﷺ نے کبھی اپنے کسی کام کرنے والے کو اس کی غلطی پر مارا نہیں، اپنے کسی صحابیؓ کی کسی غلطی پر ڈانٹا نہیں، ہاں اگر اسلام اور دین کے معاملہ میں کوئی غلطی کرتا تو آپ ﷺ بہت ناراض ہوتے، ایک مرتبہ آپ ﷺ اپنے آخری زمانہ میں یہ فرمانے لگے کہ دیکھو اگر کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو، میری طرف سے اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو وہ اس کا بدلہ اسی زندگی میں لے لے، آخرت پر نہ اٹھا رکھے اس پر ایک صحابیؓ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ آپ ﷺ کا کوڑا میری پیٹھ پر لگ گیا تھا اس پر آپ ﷺ نے اپنی پیٹھ کھول دی کہ اس پر کوڑا مار لو وہ

صحابیؓ کوڑا کیا مارتے لپٹ گئے اور مبارک پیٹھ کو چوم لیا، اپنے رفقاء کے ساتھ اتنے با اخلاق تھے کہ کوئی فائدہ کی بات ہوتی تو اپنے ساتھی کو ترجیح دیتے، آگے بڑھاتے، ذمہ داری اور مشقت کی بات ہوتی تو خود آگے بڑھ آتے، آپ ﷺ نے اعلان فرمادیا تھا کہ انتقال کرنے والا جائیداد چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارثوں کی ہے اور اگر قرضہ چھوڑ جائے تو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے، آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی بہت چہیتی بیٹی تھیں، ہمیشہ ساتھ رہتی تھیں، دوسری صاحبزادیوں کی طرح اپنے شوہروں کے ساتھ علیٰحدہ نہیں رہیں، کیونکہ ان کے شوہر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے اپنے بیٹے کی طرح رکھا تھا پھر داماد بنایا، وہ ساتھ میں رہتے تھے لیکن بیٹی کو چہیتی ہونے کے باوجود، آپ ﷺ نے ان کو دولت وثروت نہیں عطا کی نہ ایسا انتظام فرمایا کہ وہ کسی خادمہ کو رکھ سکیں، وہ گھر کا سارا کام اور شوہر کی خدمت اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں، پانی بھی خود بھر کر لاتی تھیں، آپ ﷺ نے ان کو کوئی خادم یا خادمہ مہیا نہیں کی حالانکہ خادم اور خادمائیں آتی تھیں اور آپ ﷺ دوسروں کو دیتے تھے، حضرت فاطمہؓ نے عرض بھی کیا آپ ﷺ نے ان کو کچھ پڑھنے کو بتادیا مگر خادمہ نہیں دی، حالانکہ یوں بہت محبت وشفقت کرتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی بہت خیال فرماتے تھے، ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کچھ ناگواری ہوئی، جیسی شوہر وبیوی کے درمیان کبھی کبھی ہوجاتی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں جاکر لیٹ گئے آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو خود منانے تشریف لے گئے حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے بہت چھوٹے تھے، آپ ﷺ نے ان کی پرورش بچپن سے کی تھی لیکن آپ ﷺ نے ان کو محبت کے ساتھ جگایا، فرمایا ارے تمہارے جسم میں مٹی بھر گئی ہے اٹھو! کوئی غصہ نہیں کیا اور نہ اپنی صاحبزادی کی طرف داری میں ان کو سخت بات کہی، آپ ﷺ بات کرنے والے کی بات اخلاق و

ہمدردی کے ساتھ سنتے تھے، وہ کچھ مانگتا اور وہ چیز ہوتی تو ضرور دے دیتے تھے، خواہ خود کو تکلیف ہو جائے، ایک مرتبہ ایک نئی شال آپ ﷺ کے پاس آئی، کسی نے مانگ لی آپ ﷺ نے اسی وقت اس کو دے دیا حالانکہ آپ ﷺ کو ضرورت بھی تھی اور جب مانگنے والے کو دینے کے لئے آپ ﷺ کے پاس کچھ نہ ہوتا تو نرم کلامی اور ہمدردی کے ساتھ اس کو واپس کرتے، آپ ﷺ اپنے صحابہ میں یوں گھل مل کر رہتے اور بات کرتے کہ نہ جاننے والوں کو پریشانی ہو جاتی کہ مجمع میں کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ہجرت مدینہ کے موقع پر جب قبا پہنچے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے ساتھ دیکھنے والے نہ پہچان سکے کہ ان میں کون رسول اللہ ہیں، جب دھوپ سے آڑ کر دی، تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ وہ ہوں گے جن پر دھوپ کی وجہ سے چادر تانی گئی۔

ضرورت مندوں کی مدد میں اس قدر بڑھتے ہوئے تھے اس کی مثال نہیں ملتی اس کے ساتھ ساتھ اپنے رب کی عبادت اور خوشنودی کے لئے جو زیادہ سے زیادہ ہو سکتا تھا کرتے تھے، رات کو تہجد اتنی دیر تک پڑھتے کہ پیروں میں ورم آجاتا، نفل روزے اتنے رکھتے کہ بعض وقت ایک ایک مہینہ گزر جاتا اور رمضان میں عبادت اور غریبوں کی مدد اپنے انتہا کو پہنچ جاتی، ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ عبادت میں اتنا کیوں اپنے کو کھپاتے ہیں، آپ ﷺ کے اگلے پچھلے گناہ سب اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ، کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں، وسیع القلب اتنے تھے کہ مکہ میں تیرہ سال سخت تکلیف دیئے جانے کے باوجود جب مکہ پر آپ ﷺ کا غلبہ ہوا اور آپ ﷺ فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے اور وہ لوگ سامنے آئے جنہوں نے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، سازش کر کے رات میں قتل کر دینے کی بھی تدبیر کی تھی،

آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ تم سب آزاد ہو میں انتقام نہیں لیتا، دس سال مکہ میں ایذاء دیئے جانے کے بعد طائف تشریف لے گئے تھے کہ وہاں کوئی بااثر شیخ قبیلہ اگر آپ ﷺ کی بات کو قبول کر لے تو اس سے مکہ میں آپ ﷺ کو تقویت وحفاظت مل سکے گی، لیکن وہاں کے سرداروں نے مکہ کے سرداروں کا سا ہی رویہ اپنایا، آپ ﷺ کو شہر سے نکال دیا، اوباش لڑکے پیچھے لگا دیئے جو پتھر مارتے تھے آپ ﷺ کی اس کسمپرسی اور بے بسی پر پروردگار کو بہت رحم آیا اس نے فرشتہ بھیجا کہ آپ ﷺ کہیں تو ان طائف والوں کے اوپر ان کے دونوں جانب کے پہاڑوں کو ملا دیا جائے اور ان کا خاتمہ کر دیا جائے، آپ ﷺ راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ ''اگر یہ بات نہیں مانتے تو کیا عجب ہے کہ ان کے بعد آنے والی نسل بات مان لے اور مسلمان ہو جائے'' اور سخت تکلیف اٹھانے کے باوجود انتقامی طریقہ نہیں اختیار کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بحیثیت نبی کے بہت اونچا ہے، لیکن اسی کے ساتھ بحیثیت انسان کے اخلاق، محبت، ہمدردی، انسان نوازی، خوش اخلاقی، خاکساری، تواضع، مہمان داری، غرباء پروری، مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی بھی انتہائی بڑھی ہوئی تھی، ایک طرف آپ ﷺ نبوت کے کمالات کا مظہر تھے اور دوسری طرف انسانی خوبیوں کا اعلیٰ پیکر تھے، ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ دونوں پہلوؤں سے کرنا چاہئے، ایک طرف یہ کہ اس سے ہم کو شریعت کی تعلیمات ملتی ہیں جن پر عمل کر کے خدا کو راضی کر سکتے ہیں اور اپنی آخرت بنا سکتے ہیں، دوسری طرف یہ کہ انسانی وبشری خوبیوں اور خصلتوں کے کیسے کیسے اعلیٰ نمونے سامنے آتے ہیں، جن کے اختیار کرنے سے دنیاوی اعتبار سے اور سماج کے اندر ہم ایک اعلیٰ خصلتوں کے انسان بن سکتے ہیں، ہم صرف روشنی کر کے اور صرف معجزات بیان کر کے خود اپنے کو بہت مسرور تو کر لیتے ہیں لیکن رسول پاک کو خوش کرنے کے

لئے یہ روشنی اور شاندار مظاہرے مفید نہیں، مفید تو آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے اخذ فیض سے آپ ﷺ کی سنت کی اتباع کرنا، انسانوں کے لئے ہمدردی اور محبت وعنایت کا اختیار کرنا ہے، ہم کو دیکھنا چاہئے کہ ہم اپنے ذوق کی تسکین اور دکھاوا کرنا چاہتے ہیں یا رسول پاک کی خوشی کے کام کرنا چاہتے ہیں، ہماری سیرت پاک کی محفلوں میں اتباع سنت رسول ﷺ کو ضرور سامنے لانا چاہئے تا کہ آخرت میں آپ ﷺ سے اگر ملاقات مقدر ہو تو آپ یہ نہ فرمائیں کہ تم نے ہم کو تو خوش نہیں کیا صرف اپنے کو ہی خوش کرتے رہے اور شان وشکوہ سے اپنا دل بہلاتے رہے، اور ہماری سنتیں مٹتی رہیں، کتنے غریب غربت برداشت کرتے رہے اور دولت مند دولت کو صرف ذوق اور دکھاوے میں اڑاتے رہے، امت پریشان رہی اور خوشحال لوگ مزے اڑاتے رہے۔

سیرت نبویؐ میں اعتدال وتوازن

ہمارے حضور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام میں اعتدال کا طریقہ اختیار کرنے کو پسند فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خیر الأمور أوسطها" معاملات میں بہتر وہ ہیں جو درمیانی ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے متعدد موقعوں پر از خود اپنے عمل سے بتایا اور توجہ دلائی۔

آپ ﷺ کے پاس تین صحابیؓ بڑے ایمانی جذبے کے ساتھ آئے۔ ایک نے کہا کہ رات رات بھر میں عبادت کیا کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں کبھی شادی نہ کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میں تم میں سب سے زیادہ متقی اور اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور رات کو عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور روزے رکھتا ہوں اور روزے سے خالی دن بھی چھوڑتا ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقے پر نہیں وہ ہم میں نہیں ہے۔ اسی طرح حج کے موقع پر ایک صحابی کہ میں بیمار ہوگئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یارسول اللہ میں سوچتا ہوں کہ اپنا سارا مال ومتاع اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں، آپ ﷺ نے فرمایا، سارا مال صدقہ نہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ نصف

صدقہ کردوں، آپ ﷺ نے فرمایا نصف نہ کرو، انھوں نے کہا ایک تہائی کردوں، فرمایا ایک تہائی کر سکتے ہو اگرچہ وہ بھی زیادہ ہے، دیکھو! تم اپنے بچوں کے لئے اتنا مال چھوڑ جاؤ کہ وہ اس سے اپنا کام چلا سکیں یہ بہتر ہے اس بات سے کہ تم ان کو فقیر کی طرح چھوڑ جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔

اسی طرح ایک صاحب اپنی ضرورتیں مانگ کر پوری کرتے تھے آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ تمہارے پاس کچھ سامان ہے، انھوں نے بتایا کہ ایک پیالہ ہے اور ایک چادر، آپ ﷺ نے کہا کہ لاؤ۔ آپ ﷺ نے اس کو نیلام فرمایا، وہ دو درہم میں فروخت ہوا، آپ ﷺ نے ایک درہم ان کو دیا کہ اس سے تم اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے کھانے کا انتظام کرو، اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خریدی اس میں دستہ لکڑی سے کاٹ کر خود لگایا اور ان صاحب کو دیا کہ اس سے لکڑی کاٹ کر لایا کرو اور فروخت کیا کرو اور اس طرح اپنی کمائی سے کام چلایا کرو۔

ایک طرف آپ ﷺ کا یہ انداز تھا، دوسری طرف یہ تھا کہ دو بھائی تھے ایک بھائی کام کاج اور محنت کرتے، دوسرے بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دین سیکھنے کے لئے حاضری دیتے تھے تو ایک روز کام کرنے والے بھائی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یہ میرے بھائی ہیں ہاتھ نہیں بٹاتے اپنا سارا وقت آپ ﷺ کی خدمت میں ہی رہ کر گزار دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو کام سے جو آمدنی ہوتی ہے کیا عجب ہے کہ تمہارے ان بھائی کے دین سیکھنے کی برکت ہی سے ہو رہی ہو۔ یعنی آپ ﷺ نے محسوس کرلیا کہ وسیلہ اختیار کرنے کے باوجود رزق اللہ دیتا ہے اسی کی مرضی کا کام ہو تو برکت ہوتی ہے ورنہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہے۔

حضرات انصار رضی اللہ عنہم زراعتی کام کرنے والے تھے جہاد اور دوسرے

دینی کاموں کے تسلسل سے وہ کاشتکاری اور باغبانی کو ایک عرصہ تک کوئی زیادہ وقت نہ دے سکے ایک موقع پر وہ یہ محسوس کر کے کہ ہم اب اپنی کاشتکاری وغیرہ میں مسلسل لگ سکتے ہیں، ادھر متوجہ ہوئے تو ان کے کمائی کے کام میں لگ جانے سے اسلام کے بڑھتے ہوئے قافلہ کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا اس لئے قرآن پاک میں فرمایا گیا "وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" کہ اپنے کو تباہی میں نہ ڈالو، یعنی اگر تم دنیا کی طرف (اگرچہ وہ جائز ہے) دین کا کام چھوڑ کر لگ گئے تو یہ تمہارے لئے تباہی کی بات ہوگی۔

یہ تھا وہ اعتدال اور درمیان کی راہ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈالا تھا اور اس کی تربیت دی تھی کہ اپنی دنیاوی زندگی کی حسب ضرورت فکر رکھو اور اپنے دین کے حق کو بھی پوری طرح ادا کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "الدین یسر" کہ مذہب آسان ہے، اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کے لئے مذہب کو آسان بنادیا ہے اس پر پوری طرح عمل کرنا آسان ہے، دین پر پورا عمل کرنے سے برکت ہوتی ہے اور اللہ کی نصرت کے وعدے پورے ہوتے ہیں، امت محمدیہ کے لئے اس میں آسانی ہے اور یہی اس فلاح کی راہ ہے۔

اسلام میں دین و دنیا دونوں کی رعایت رکھی گئی ہے، اس میں آسانی کے ساتھ اعتدال بھی ہے اس طرح دین پر عمل آسانی اور خوبی کے ساتھ ہوتا ہے، آدمی کو ایسے مجاہدے نہیں کرنا پڑتے کہ اس کی طاقت سے باہر ہوں، یہ ایسی نعمت ہے کہ کسی دوسرے مذہب میں نہ ملے گی، اس کے بعد مسلمانوں کا دین پر عمل کرنے میں کوتاہی کرنا بہت عجیب بات بھی ہے اور افسوس کی بات بھی ہے۔

رسول پاک ﷺ کی انسانیت نوازی اور رحمۃ للعالمینی

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کی اعلیٰ خوبیوں کے ساتھ اخلاق طیبہ اتنی محبت، رحم دلی اور انسانی ہمدردی کے حامل تھے کہ اس سے زیادہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" کہ آپ ﷺ عظیم اخلاق کے حامل ہیں اور فرمایا گیا "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کہ ہم نے تم کو سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، آپ ﷺ ایک طرف تو اپنے پروردگار کو راضی رکھنے کے لئے ہر طرح کی مشقت اور تکلیف اٹھاتے اور اس کی مرضیات پر عمل کرتے، دوسری طرف سارے انسانوں کے ساتھ ہمدردی و محبت کا ایسا عمل کرتے کہ اس کی مثال نہیں ملتی، آپ ﷺ عبادت گذار اور شب زندہ دار .ایسے تھے کہ رات کی نماز یعنی تہجد میں اتنی اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ پیروں میں ورم آجاتا، روزے اتنے رکھتے کہ رمضان سے قبل شعبان کا مہینہ بھی اکثر و بیشتر روزوں میں گزر جاتا، مال کو اللہ کی راہ میں اتنا خرچ کرتے کہ خود کوئی ایسی چیز نہ ہوتی جس کے لئے گھر والوں کو آگ جلانا پڑتی، کبھی کھجور کے کچھ دانے حاصل ہو گئے انہی سے کام چلالیا اور کبھی بکری کا دودھ ہوا اسی کو پی کر مطمئن ہو گئے، کبھی کچھ بھی نہ ملا تو

یوں بے کھائے پیے رہ گئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ مال ومتاع سے بالکل محروم تھے، ایسا نہیں تھا بلکہ عموماً آپ ﷺ کی ضرورت کے مطابق مال ہو جاتا تھا، مدینہ منورہ میں آپ کی کل آمدنی کچھ کھیتوں اور باغوں سے بھی ہونے لگی تھی جو آپ ﷺ کو حاصل ہو گئے تھے، لیکن آپ ﷺ کی طرف سے دوسروں کی مدد، دادودہش اور مہمانوں کی مہمان داری اور اصحاب صفہ (جو دین سیکھنے کے لئے آپ ﷺ کے مکان کے سامنے مسجد کے ایک سرے پر مقیم رہتے تھے) ان کے کھانے کی ذمہ داری بھی آپ ﷺ اپنی ذاتی ذمہ داری کی طرح اٹھائے ہوئے تھے، یہ اصحاب صفہ بعض بعض مرتبہ ۷۰ کی تعداد تک پہنچ گئے تھے، ان میں ایک صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تھے جنھوں نے وہاں رہ کر خوب حدیثیں سنیں اور علم دین سیکھا، چنانچہ آج حدیث شریف کا خاصا حصہ ان ہی سے مروی ہے، ان ہی سے روایت ہے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا، اصحابِ صفہ بھی بھوکے تھے کہ آپ ﷺ کے پاس کہیں سے دودھ کا ایک پیالہ ہدیہ میں آیا، آپ ﷺ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: یہ دودھ آیا ہے سب اصحاب صفہ کو بلا لاؤ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے تعجب ہوا کہ اتنے دودھ میں کتنے آدمی کام چلا سکیں گے، یہ تو خود آپ ﷺ پی لیتے اور کچھ بچتا تو مجھ کو دے دیتے، بجائے اس کے متعدد آدمیوں کو بلا کر پلایا جائے کسی کا بھلا نہ ہوگا، لیکن کیا کرتا، حکم تھا، میں بلا لایا، آپ ﷺ نے وہ پیالہ ایک کو دیا کہ پیو! پھر دوسرے کو دیا، پھر تیسرے کو دیا اور وہ سب پیتے رہے اور حیرت کی بات یہ کہ وہ چلتا رہا حتی کہ بلائے ہوئے سب آدمی پورے ہو گئے، پھر آپ ﷺ نے پیالہ اپنے ہاتھوں میں لیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور فرمایا! ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہم رہ گئے ہیں اور تم، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یوں بھی امتحان ہو رہا تھا کہ ہر پینے والے پر سوچتے ہوں گے کہ دودھ اب ختم ہوا تب ختم ہوا، میری باری دیکھو آتی بھی ہے یا

نہیں آتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کہنے پر کہ اب ہم رہ گئے ہیں اور تم اور پیالہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ہے اور تھوڑا دودھ ہے، ظاہر ہے کہ اب آپ ہی مستحق ہیں کہ اس کو پورا کردیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رہ جائیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے اس جملہ پر کہ اب ہم رہ گئے ہیں اور تم، کہا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا! لواب تم پیو، وہ کہتے ہیں کہ میں نے پیا اور دودھ پھر بھی بچ گیا، میری طبیعت سیر ہوگئی، آپ ﷺ نے فرمایا اور پیو، میں نے اور پیا، آپ ﷺ نے فرمایا اور پیو! میں نے کہا یا رسول اللہ، اب طبیعت سیر ہوگئی ہے، پھر آپ ﷺ نے پیالہ واپس لیا اور اس کو پورا کردیا۔

اس واقعہ کے اندر کئی باتیں آگئی ہیں ایک تو کھانے پینے کی چیزوں کی کمی، اور جب کوئی چیز آجاتی تو آپ ﷺ سب کو دے کر کھاتے پیتے، دوسرے یہ اخلاق، کہ چیز کے کم ہونے کے باوجود سب کا خیال رکھنا اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا، تیسری اس بات کی تربیت دینا کہ دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینے کا مجاہدہ ہو، اور اپنے محروم رہ جانے کا خطرہ برداشت کیا جائے، چوتھے یہ کہ اگر اخلاص اور بےنفسی اور دوسروں کی ہمدردی کے جذبہ سے کام کیا جائے تو برکت ہوتی ہے اور کم چیز زیادہ آدمی کے کام آجاتی ہے، یہ برکت ہر وقت نہیں ہوتی، یہ اس وقت ہوتی ہے جب جذبہ بھی اعلیٰ ہو اور مسئلہ کا حل کوئی دوسرا نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے اور وہ تھوڑی چیز کو زیادہ کے قائم مقام بنادیتا ہے۔

اس طرح کی برکت کا واقعہ غزوۂ خندق میں پیش آیا تھا اور ایک واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا تھا، جس میں اس طرح اخلاص و نیک نیتی اور ایثار کے جذبہ کی حالت میں کوئی دوسرا حل نہ ہونے پر اللہ تعالیٰ نے تھوڑی چیز کو زیادہ چیز کے قائم مقام بنادیا، تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں، بہرحال یہ بات قابل توجہ ہے کہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی ایسا موقع آتا کہ دوسرا بھی ضرورت مند ہوتو اس کو شریک کر لیتے بلکہ اس کو ترجیح دیتے۔اس ایثار اور سب کی فکر کرنے کے نتیجہ میں آپ ﷺ کے پاس ضرورت کی چیز کم ہو جانا قدرتی بات تھی، چنانچہ کئی کئی فاقوں کی نوبت آجاتی تھی، حالانکہ آپ ﷺ کو اتنا مال ذاتی طور پر حاصل ہوتا تھا کہ روک روک کر خرچ کرتے تو آپ ﷺ اپنا کام اس کے ذریعہ بخوبی چلا سکتے تھے، لیکن آپ کو اپنے ساتھیوں کی، اپنے پڑوسیوں کی، اپنے مہمانوں کی اتنی فکر اور ہمدردی ہوتی تھی کہ آپؐ ان کی فکر، اپنی فکر کی طرح رکھتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک بار اعلان فرمایا کہ کوئی مسلمان انتقال کر جائے تو اس کا چھوڑا ہوا مال اس کے وارثوں کا ہے اور جو وہ قرض چھوڑ گیا ہو اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے، بھلا یہ کون کر سکتا ہے، پھر ایک دو کے لئے اپنے تمام ساتھیوں اور ماننے والوں کے لئے، کہ فائدہ ہو تو تم لو اور نقصان ہو تو اس کی تلافی میرے ذمہ ہے۔

آپ ﷺ نے اپنے ان اخلاق ومحبت کی خصلتوں سے لوگوں کے دل جیت لئے تھے، جو بھی آپ ﷺ سے ایک مرتبہ مل لیتا آپ ﷺ کا گرویدہ بلکہ فریفتہ ہو جاتا، وہ دیکھتا کہ آپ ﷺ کو دنیاوی فائدے کی کوئی فکر نہیں، آپ ﷺ کو اپنی ذات کے لئے فائدہ اٹھانے سے کوئی دلچسپی نہیں، دوسروں کی ہمدردی اور دوسروں کی فکر صرف دنیاوی فائدے ہی کے لئے نہ تھی بلکہ زیادہ فکر آخرت کے فائدے کی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اور تمہاری مثال ایسی ہے جیسے آگ جل رہی ہو اور اس میں لوگ گر رہے ہوں، میں کمر پکڑ پکڑ کر لوگوں کو اس سے بچا رہا ہوں، آپ ﷺ کی یہ فکر اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا: ”لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ“ آپ ﷺ شاید اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے کہ یہ لوگ ایمان والے کیوں نہیں بن جاتے، اور واقعی آپ ﷺ

کڑھتے رہتے تھے کہ لوگ گمراہ ہیں ان کا آخرت میں کیا ہوگا، ان کو گمراہی سے کیسے نکالا جائے، اس کے لئے آپ ﷺ نہ زورزبردستی کرتے تھے، نہ ڈانٹتے نہ سختی کرتے بلکہ محبت سے، اخلاق کے ساتھ ان سے مخاطب ہوتے اور نرمی کے ساتھ سمجھاتے، ایک طرف آپ ﷺ کی انسانیت نوازیاں، ہمدردیاں، دوسری طرف آپ ﷺ کی طرف سے اپنی اور دوسروں کی عافیت کی فکر اور اس فکر میں کڑھنا، یہ ایسا حال تھا کہ جو بھی اس وقت قریب سے دیکھ لیتا بالکل بدل جاتا اور آپ ﷺ کا ہوجاتا، بعض وقت کوئی شخص کفار قریش کے بہکانے پر آپ ﷺ کو قتل کرنے کے لئے آتا اور آپ ﷺ کا سامنا ہوتے ہی، آپ ﷺ کے میٹھے بول سنتے ہی ڈھیلا پڑ جاتا تھا، ارادہ ختم ہوجاتا اور بات چیت ہوتی گرویدہ ہوجاتا اور آپ ﷺ پر فدا ہوکر لوٹتا۔

لوگوں کے فائدے اور آخرت میں نجات کی فکر آپ کے دل میں اتنی تھی کہ آپ ﷺ نہایت شفیق، ہمدرد اور محبت کرنے والے بن چکے تھے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس طرح بیان فرمایا: "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَاعَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ" کہ تمہارے پاس تم میں کا ہی رسول آیا، اس کو تمہاری تکلیف بہت شاق ہوتی ہے، وہ تمہاری بے حد فکر کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے تو بہت ہی ہمدردی اور رحم کا جذبہ رکھنے والا ہے۔

بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں انسانیت نوازی، اخلاق ومحبت کی خصوصیات، اس قدر بڑھی ہوئی غیر معمولی تھیں کہ جس کو واسطہ پڑتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ آخرت میں سرخرو ہونے کے لئے آپ ﷺ کی جو توجہ دہانی اور نصیحت ودعوت تھی کہ آپ ﷺ کڑھتے رہتے تھے کہ کس طرح لوگوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی آخرت کو ٹھیک کرنے اور آخرت میں راحت کی زندگی

پانے کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، ایمان لائیں اور عمل صالح کریں، ایک طرف آپ ﷺ مجسم ہمدردی اور محبت تھے، دوسری طرف انسانی قدروں کے اعلیٰ درجہ کے محافظ اور داعی تھے، تیسری طرف آپ ﷺ اپنی زندگی کو، اپنے مال ومتاع کو رضائے الٰہی کے حصول اور دنیا وآخرت کی فلاح کا طریقہ بتانے اور خود اس پر عمل کرنے پر لگائے ہوئے تھے۔

ساری انسانیت کے لیے نعمت و رحمت

اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس وقت ہوئی، اس وقت دنیا مادّی ترقی کے بلند ترین مقام تک پہنچی ہوئی تھی ایران اور روم میں تمدن علم، وسائل راحت، اعلی درجہ تک پہنچ چکے تھے، اس کی تفصیلات دیکھی جائیں تو حیرت ہوتی ہے، آج کے انسان نے اپنے متمدن علاقوں میں زندگی کی راحتوں کا جو سامان کرلیا ہے اس زمانہ کے جو قلبی سکون اور ذہنی راحت اس کو مطلوب تھا وہ بالکل حاصل نہ کرسکا تھا، بلکہ وہ اس لحاظ سے ایک مصیبت کی کیفیت میں تھا، اور یہ کیفیت بڑھتی جارہی تھی، جس کے پاس پیسہ اور اقتدار ہوتا ہر طرح کی نعمتوں اور راحتوں کو جمع کرلیتا، اور جس کے پاس پیسہ نہ ہوتا وہ سوسائٹی میں جانور سے بدتر حیثیت رکھتا تھا، بیل، بھینس، گھوڑے کو وہ تکلیف و بے بسی جھیلنی نہیں پڑتی تھی جو ایک غلام انسان کو یا ایک نوکر کا کام انجام دینے والے کو جھیلنا پڑتی تھی، حتی کہ دولت مندوں کی معیاری دعوتوں میں محض لطف مجلس اور سرور محفل کے لئے کھانے کے اوقات میں غلام یا قیدی پکڑ کر لائے جاتے اور ان کو آگ لگا کر مشعل کے طور پر استعمال کیا جاتا اور لوگ دعوت کھاتے جاتے اور غلام کے جلنے اور تڑپنے سے لطف لیتے جاتے جیسے کوئی آتش بازی یا پھلجھڑی سے لطف لیتا ہے، اپنے کو اس سے برتر سمجھنے والی

قومیں دوسری قوموں کو جانور سے کمتر درجہ کی سمجھتی تھیں، اور ان کے کہنے والے کہتے تھے کہ ان کے آدمیوں کو لوٹ لینا، مار ڈالنا ان کی زندگی اور موت سے اپنے مفاد کی خاطر کھیلنا اور برباد کر دینا کوئی جرم نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر انسان کو اس ظلم سے آزادی دلائی آپ ﷺ نے نعرہ دیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے، سب ایک آدم کی اولاد، ایک خدا کے بندے ہیں، نہ کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا، اور پھر آپ نے اپنے عمل سے یہ کر کے دکھا بھی دیا، کہ عربوں کے معزز ترین قبیلہ قریش کی معزز ترین شاخ کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود آپ ﷺ رومی نسل کے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ، کالے حبشی نسل کے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو، سرخ ایرانی نسل کے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے، اور اس طرح برابری کا معاملہ کرتے جس طرح اپنے ہم خاندان کے کسی قریش کے ساتھ معاملہ کرتے، اور آپ ﷺ نے اس پر صرف عمل کر کے دکھانے کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کی بانگ دہل تلقین کی، آپ ﷺ کے عمل اور پھر اس کی تلقین کے نتیجہ میں مساوات کی یہ رسم ایسی چلی کہ انسانی تاریخ نے پھر یہ دیکھا کہ آزاد اور معزز نسل کے مسلمان بادشاہوں کے علاوہ آزاد نسل مسلمانوں پر غلام نسل کے بھی بادشاہ ہوئے، اور اسلامی تاریخ میں بار بار ہوئے اور اس پر کسی نے یہ نہیں کہا، کہ غلام نسل کے آدمی ہم پر کیسے بادشاہ ہو سکتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو جو پیغام خداوندی سنایا، اس میں سب سے اول بات یہ تھی کہ انسان کا سر سوائے اپنے مالک حقیقی کے جو خدائے واحد ہے کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھک سکتا، اور وہ سوائے خدائے واحد کے کسی کو حقیقی نافع یا نقصان رساں نہیں سمجھ سکتا، آپ ﷺ نے اس طرح انسان کو انسان کی بلکہ جانوروں، درختوں، ستاروں، دریاؤں اور پہاڑوں کی بندگی و عبادت سے نکال کر تنہا خدائے واحد کی عبادت تک محدود کر دیا، اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے انسان کی

فضیلت تمام زمینی مخلوقات پر بتائی اور ان مخلوقات کو انسان کا خادم بتایا۔ پھر آپ ﷺ نے انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھایا، اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ اپنائیت اور برادرانہ محبت کرنا سکھائی، اپنے اہل خاندان کے ساتھ سلوک وتعاون کی تلقین کی پڑوسیوں کے ساتھ سلوک کرنے کی ایسی تاکید کی، کہ بعض صحابہ ؓ کو شبہ ہونے لگا کہ، کہ ان کو اپنے غیروں اور قرابت داروں کا مرتبہ نہ دے دیں اور وراثت میں شریک قرار نہ دے دیں، اپنوں کے علاوہ غریبوں کی بھی راحت کا خیال رکھنے کی ہدایت فرمائی، اور یہ تلقین فرمائی کہ راستہ میں کوئی چیز ایسی پڑی دیکھو جس سے کسی چلنے والے کو تکلیف پہنچ سکتی ہو تو اس کو ہٹادو، اس کام کا تم کو اجر ملے گا، آپ ﷺ کو اپنی اہلیہ کی طرف سے جو غلام حاصل ہوئے تھے، ان کو آزاد فرما کر ان کے ساتھ عزیز بلکہ بیٹے جیسا معاملہ رکھا، حتیٰ کہ اپنی ایک قریب ترین عزیزہ سے جو عربوں کے معزز ترین قبیلہ قریش کی فرد تھیں ان کی کی شادی کردی، اس طرح آپ ﷺ نے یہ دکھادیا کہ آقا و غلام کو کس انتہائی حد تک یکساں کیا جاسکتا ہے۔

آج دنیا نے جمہوریت و مساوات کے جو اعلیٰ سے اعلیٰ نظریات پیش کیے ہیں، اور اس کو ان پر عمل کرنے کا دعویٰ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کردہ عملی مساوات کا ایک چھوٹا نمونہ بھی پیش نہیں کرسکتی، امریکہ آج جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے لیکن وہ کالوں کو گوروں کے مساوی سمجھنے میں کوتاہی کرنے میں ابھی تک بچ نہیں سکا ہے زندگی کے مختلف میدانوں میں سیاست میں، تعلیم میں، معاشرت میں ہر جگہ وہاں دونوں میں فرق کیا جاتا ہے، جنوبی افریقہ میں انگریزوں نے ابھی چند برسوں قبل تک سیاسی اور سماجی زندگی میں کالوں کو عزت واحترام سے انتہائی دور رکھنے اور ان کو کمتر سمجھنے کا جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ ظلم کی انتہائی مثال ہے، یورپ میں باوجود ساری ترقیات کے آج بھی انسان انسان میں فرق کیا جاتا ہے، لیکن

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معزز ترین سمجھی جانے والی نسل اور معزز ترین شاخ کے فرد ہونے کے باوجود غلاموں اور سماجی طور پر دبے کچلے انسانوں کے ساتھ برابری، مساوات اور عزت کا جو معاملہ کیا، اور برابر کرتے رہے، اور اس کی تلقین کرتے رہے، پوری انسانی تاریخ اس کی مثال نہیں پیش کرسکتی، اس سلسلہ میں آپ ﷺ کی تلقین و ہدایت اور سخت تاکید کے اثر سے آپ ﷺ کے ماننے والوں نے بھی اس مساوات اور انسانی ہمدردی پر اعلیٰ کارنامے دکھائے، مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ملک شام کا ایک بادشاہ مسلمان ہوکر حج کرنے آیا، وہ اپنے شاہی کروفر کے لباس میں مشغول طواف تھا، کہ ایک غریب اور دیہاتی کا پیر اس کے دامن پر پڑ گیا، جس سے وہ بادشاہ پھنس کر گرنے کے قریب ہوگیا، اس کو ایسا غصہ آیا، کہ اس نے اس غریب دیہاتی کو طمانچہ ماردیا۔ دیہاتی نے خلیفۂ وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونوں کے سماجی فرق کا لحاظ کئے بغیر بدلہ دلانے کا حکم دیدیا کہ بدوی کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اسی طرح اس بادشاہ کے طمانچہ مارے، بادشاہ نے کہا کیا یہ بھی ہوسکتا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں حصول انصاف میں سب برابر ہیں، بادشاہ نے ایک روز کی مہلت طلب کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ مہلت دیدی، وہ رات ہی رات بھاگ گیا، اور اسلام سے ہٹ گیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے انصاف پسند فیصلہ پر سے نہیں ہٹے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت نوازی، مساوات اور کمزوروں کی مدد کی جو تلقین فرمائی، اس کا اثر آپ ﷺ کی امت میں نمایاں طریقہ سے ظاہر ہوتا رہا۔ اور شاندار مثالیں سامنے آتی رہیں۔ آپ ﷺ نے صرف انسانوں ہی نہیں بلکہ ہر ذی حیات کے ساتھ ہمدردی کی تلقین فرمائی، آپ ﷺ کا فرمان تھا کہ "في ذات كل كبد حرى لكم أجر" ہر گرم کلیجہ رکھنے والی شے کا خیال رکھنے پر تم کو اجر ملے گا۔

ظلم کو جانوروں کے ساتھ بھی روا رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ بے زبان جانور کی تکلیف دور کردینے پر بھی اجر بتایا، اور تلقین کے طور پر کئی واقعات بتائے کہ پیاسا جانور کو پانی پلا دینے پر ایک بڑے گنہگار کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش ہوگئی، اور ایک جانور کو بہت دکھ دینے پر آدمی کو جہنم کا عذاب ملا۔

آپ ﷺ اس دنیا سے جب رخصت ہو رہے تھے، آپ ﷺ کی زبان مبارک پر خاص طور پر دو نصیحتیں تھی، کہ دیکھو کہ اپنے پروردگار کی عبادت (نماز) کو قائم رکھنا اور اپنے غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، آپ ﷺ نے اس کی اہمیت اتنی محسوس کی کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی آپ ﷺ نے اس کی طرف توجہ دلائی کہ امت کے لوگ اس کی اہمیت کو سمجھیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " من لم یوقّر کبیرنا ومن لم یرحم صغیرنا فلیس منّا" کہ ہمارے معاشرہ میں جو اپنے بڑوں کا احترام نہ کرے اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ رحم دلی نہ کرے وہ ہماری جماعت میں سے نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے کمزور ہونے کی بے حد رعایت فرمائی اور ایسے احکام دیئے جن میں عورت کی عصمت کی حفاظت، اس کے باعزت مقام کا بڑا لحاظ ہے، آپ ﷺ نے عورت کو باعزت مقام دلایا، ورنہ عورت کو مرد کے لئے کھلونہ، خدمت اور راحت رسانی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے حقوق کو بری طرح پامال کیا جاتا تھا، اس کو پیدا ہوتے وقت ہی سے ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ بچپنے میں زندہ دفن کردیا جاتا تھا، آپ ﷺ نے عورت کو مرد جیسی عزت والا بنایا بلکہ بچیوں کی پرورش کا ثواب لڑکوں کی پرورش سے بھی زیادہ بتایا، اور عورت خواہ بیوی ہو خواہ ماں ہو تو اس کے حقوق علاحدہ علاحدہ اعلیٰ سطح سے مقرر فرمائے اور ان

کی ادائیگی کی تاکید فرمائی، بیٹی کا حق بیٹے کے ساتھ ضروری قرار دیا۔ اور اس کو با قاعدہ مقرر فرمایا۔ بھائی کے ساتھ بہن کا بھی حق بتایا اور اس کو بھی مقرر فرمایا، بیوی اگر شوہر کا ظلم دیکھے تو اس کے لئے علاحدگی کا طریقہ طے فرمایا۔

آپ ﷺ کی محبت و ہمدردی صرف انسانوں تک محدود نہیں رہی، نہ صرف جاندار کے ساتھ محدود رہی، بلکہ آپ ﷺ نے خدا کی دی ہوئی دولت اور دنیاوی سہولتوں کے بارے میں بھی عاقلانہ اور منصفانہ رویہ سکھایا، خرچ میں اسراف سے منع کیا، تاکہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو ضائع نہ کیا جائے، صدقہ خیرات کی تلقین فرمائی، تاکہ امیروں کی دولت غریبوں تک بھی پہنچے زکوٰۃ کے ذریعہ زائد دولت رکھنے والوں پر غریبوں کی مدد لازمی کردی تاکہ اس دنیا کی دولت و ثروت ایک جگہ اکٹھا ہو جانے سے ضائع نہ ہو، عبادات میں روزہ کا بھی حکم سنایا، جس کے ذریعہ ہر مسلمان کو بھوک و پیاس کی ایک سالانہ مشقت سے گذرنا ہوتا ہے، تاکہ اس کو محسوس ہو کہ بھوک و پیاس کیا چیز ہے، اور بھوکا انسان کیسا ہوتا ہے اس کا احساس رہے، اور کم وسائل زندگی رکھنے والے کی تصویر مسلمان کے ذہن میں قائم رہے۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ زندگی اور اپنی ارد گرد کی دنیا میں جو کچھ ہے، اس سے فائدہ اٹھانے اور اس سے فائدہ پہنچانے کے طریقے بتائے، ایسے طریقے کہ ان پر عمل کرنے سے دنیا کا سارا نظم درست ہو جاتا ہے۔ اور برائیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے، اور اس نظام پر عمل کیا جائے تو ساری دنیا، اعتدال، انصاف، امن اور بھائی چارگی کے ماحول میں چین و اطمینان اور خوش حالی کی زندگی گزار سکتی ہے، اور اس پر مزید یہ کہ اس دنیا کے ختم ہونے پر جب آخرت کی زندگی آئے گی تو وہاں مزید کامیابی اور راحت و عافیت حاصل ہوگی۔

آپ ﷺ ان عظیم تعلیمات اور خود ان پر پورا عمل کرنے کے باعث عالم

بلکہ سارے عالموں کے لئے امن وراحت کے پیامبر بنے اور مساوات اورامن و راحت کا راستہ بتانے اورراستہ ہموار کرنے کی وجہ سے رحمۃ للعالمین ثابت ہوئے، جس کی شہادت خود خدا تعالیٰ نے اپنے فرمان میں دی ہے کہ "وما أرسلناك إلا رحمةً للعالمین" کہ ہم نے تم کو مخصوص طور پر تمام دنیا جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔صلی اللہ علیہ وسلم صلاۃ و سلامادائمین متلازمین الی یوم الدین۔

نبوّت محمدی ﷺ کی تکمیل و اتمام

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا مسئلہ کبھی شک و تردد کا مسئلہ نہیں رہا، کوئی شخص شہرت اور جھوٹی عزت کے حصول کے لیے اس میں شبہ ڈالے تو کبھی کبھی چند کم سمجھ لوگ اور وہ لوگ جن کے ذہن تضاد کا شکار رہتے ہیں اور جو اپنے دماغ کے الجھاؤ کے باعث سیدھی بات سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں، وہ ایسے غیر حقیقت پسندانہ دعویٰ کو مان لیتے ہیں جو کہ کوئی شاطر آدمی یا الجھے ذہن کا شخص کر دیا کرتا ہے۔

انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ تاریخ میں سچے نبیوں کی نقل میں جھوٹے نبی بھی آتے رہے ہیں اور وہ سیدھے سادے عوام کو دھوکہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن جھوٹی اور غیر منطقی بات زیادہ نہیں چلتی ہے اور سطحی قسم کا فریب جلد کھلتا رہا ہے، چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسود العنسی، طلیحہ، اور مسیلمہ کذاب اُبھرے اور ناکام رہے۔ گذشتہ انبیاء کے زمانوں میں چونکہ خدا کو نبیوں کا سلسلہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک چلانا تھا، اس لیے اس نے ختم نبوت کا فیصلہ آپ ﷺ سے قبل نہیں سنایا، کیونکہ آپ ﷺ کے زمانہ تک قوموں اور امتوں کے بدلتے ہوئے مزاجوں کے لحاظ سے شریعت اور دین میں جو ترمیم و اضافہ فرمایا جانا تھا یہ ترمیم و اضافہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دیا گیا، کیونکہ

آپ ﷺ کے زمانہ سے تا قیامت انسانی برادری کے مزاج میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوگی، اس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً ط

''آج یعنی اب میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو میں نے تمہارے لیے بحیثیت دین پسند کیا''

دین مکمل ہو جانے کے بعد نئے نبی کی ضرورت ختم ہو گئی کیونکہ اب کوئی نئی بات بھیجی جانا نہ رہی، اب دین کو صرف پھیلانے اور عام کرنے کا کام رہ گیا تھا، جس کو علمائے دین اور داعی حضرات بخوبی انجام دے سکتے ہیں اور انجام دے رہے ہیں، اور معمولی اور چھوٹی باتوں کے لیے ان کو اجتہاد کا حق بھی ملا ہوا ہے، نعمت کو پوری کر دینے سے واضح ہوا کہ جو سلسلہ اور تسلسل نبیوں کے آتے رہنے کی نعمت کا تھا وہ تسلسل پورا ہو گیا اب نبیوں کے آتے رہنے کا سلسلہ نہ رہے گا، چنانچہ قرآن مجید میں آپ ﷺ کو خاتم النبیین قرار دیا گیا، خاتم ختم کرنے والے کے معنی میں لیا جائے یا مہر کے معنی میں لیا جائے جو خط اور دستاویز کے ختم ہو جانے کی علامت ہوتی ہے، دونوں کا مطلب ایک ہی ہے کہ آپ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، آپ ﷺ سے قبل انبیاء کے تسلسل کے زمانے میں ہر ایک نبی اپنے بعد کے نبی کی اطلاع دیتا تھا، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اطلاع دی کہ وَمُبَشِّراً م بِرَسُوْلٍ یَّأْتِیْ مِنْ م بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَد ''میں بشارت دیتا ہوں ایک نبی کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہے۔'' یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ برسولِ یعنی صرف ایک رسول کے ہیں اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور نبی آنا ہوتا تو صرف ایک رسول

کی بشارت نہ دیتے بلکہ رسولوں کا لفظ استعمال کرتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہ تھا اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اور نہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی نبی کے آنے کی خبر دی بلکہ اس کے برعکس فرمایا ''ولکن لا نبی بعدی'' کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ بہر حال عقل ونقل کے بکثرت دلائل ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا لیکن گمراہی میں مبتلا ہونے کے جہاں بہت سے میدان رہے ہیں وہاں نبوت کے جھوٹے دعوے کا بھی ایک میدان رہا ہے، البتہ گمراہی کے دوسرے میدان عقل کی بے راہ روی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جھوٹی نبوت کا میدان اسلام کے احکام سے اور مذہب کی ضرورت وتقاضے سے غافل رہنے اور آسانی سے دھوکا کھا جانے والوں کے ساتھ مخصوص رہا ہے، چنانچہ غلام احمد قادیانی نے ہی نہیں بلکہ تاریخ میں متعدد اشخاص نے عوام کو بیوقوف بنانے کی کوشش کی، چند آدمیوں نے دھوکا بھی کھایا اور ان کو نبی مان لیا، لیکن بات زیادہ نہ چل سکی اور سب ناکام رہے، لیکن چونکہ غلام احمد قادیانی کو برطانوی حکومت کا سہارا حاصل رہا بلکہ اسی کے ایماء سے یہ کام کیا گیا اور برطانیہ کی حکومت زبردست وسائل اور اثر رکھنے والی تھی اور شاطرانہ چالوں سے بھی خوب واقف تھی، وہ اسلام کے صحیح عقیدے کو بگاڑ کر مسلمانوں کی اسلامی طاقت کو پارہ پارہ کرنا چاہتی تھی چنانچہ غلام احمد قادیانی کو ہوا دی اور پشت پناہی کی جس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ غلام احمد قادیانی نے برطانوی سامراج کی بڑی تعریفیں کی ہیں، اس کو اللہ کی رحمت ونعمت قرار دیا ہے اور اس کی مخالفت کو بُرا قرار دیا ہے حالانکہ اس حکومت نے مسلمانوں کو ہندوستان میں اور باہر کی دنیا میں بہت نقصان پہنچایا اور دشمنی کی، ہزاروں ہزار کو قتل کیا پھر وہ کافروں کی حکومت تھی، کیا کسی نبی کا یہ کام ہوسکتا ہے کہ وہ ایسی حکومت کی تعریف کرے؟

انگریزوں کی طرف سے غلام احمد قادیانی کی سرپرستی اور تائید خود برطانیہ

میں محفوظ ایک دستاویز سے بھی ثابت ہو چکی ہے اور اب بھی یہ سلسلہ قائم ہے، برطانیہ اور مغرب و مشرق دونوں کی اسلام مخالف طاقتیں اس جھوٹی نبوت کی ترویج میں برابر سہارا دے رہی ہیں ان ہی کے سہارے اور مدد سے جھوٹی نبوت کا یہ فتنہ ابھی تک قائم ہے بلکہ اثر ڈال رہا ہے اور چونکہ یہ ایک فتنہ بنا ہوا ہے اس لیے اس کو ختم کرنے کے لئے مسلمان علماء اور داعیوں کو زیادہ فکر و توجہ کی ضرورت پڑ رہی ہے اس کے لئے زیادہ دلائل کی ضرورت نہیں ہے صرف اس کی حقیقت اور دھوکے بازی سے لوگوں کو ٹھیک طریقہ سے واقف کرا دیا جائے تو فتنہ خود ختم ہو جائے گا، علماء نے اس کے باطل ہونے کے سلسلے میں اپنے اپنے موقعوں پر وضاحت کی ہے اور آج کے زمانے میں بھی وضاحتوں کی ضرورت ہے کیونکہ غیر مسلموں پر جو اسلام کی حقانیت سے واقف نہیں اور خود سادہ لوح کچھ مسلمانوں پر اس جھوٹی نبوت کا فریب اب چل جاتا ہے اور خاص طور پر ایسی صورت میں کہ قادیانی تحریک بڑی دولت اور وسائل کی مالک ہے اور وہ اپنے غیر مسلم ہمدرد طاقتوں کے سہارے جگہ جگہ لوگوں کو گمراہ کرنے کا جال پھیلاتی جا رہی ہے لہٰذا علمائے دین اور اہل غیرت مسلمانوں کا فرض ہے کہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و خاتمیت کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا مقابلہ کریں۔

یہاں ایک بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قادیانی مبلغ جھوٹ سے بھی خوب کام لیتے ہیں اور موقع دیکھ کر اس بات سے انکار کر دیتے ہیں کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے، وہ یہ کہنے لگتے ہیں کہ غلام احمد آپ ﷺ کے ماتحت نبی تھے لہٰذا ان کے دھوکہ کو سمجھنا چاہئے، ان وضاحتوں سے اس جھوٹی نبوت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس فتنہ کو ختم فرمائے اور گمراہوں کو ہدایت کے نور سے منور فرمائے۔ (آمین)

دعوتِ دین اور اسوۂ نبوی ﷺ

دعوتِ دین وہ عمل ہے جس کے نتیجہ میں اصلاح کی اور عملِ صالح کو اختیار کرنے کی صورت پیدا ہوتی ہے، اور یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ایک آدمی صرف اپنے ہی عمل کے ثواب کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ ان تمام لوگوں کے ثواب کا بھی مستحق بن جاتا ہے جو اس کے کہنے اور متوجہ کرنے سے حق قبول کرنے والے اور عملِ خیر کرنے والے بن گئے وہ دو چار بھی ہو سکتے ہیں سیکڑوں اور ہزاروں بھی ہو سکتے ہیں، اس طرح امت میں بعض بعض حضرات کے ثواب کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے جن کی دعوت کے اثر سے ہزاروں اور لاکھوں کی اصلاح ہوئی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا ثواب حاصل ہو رہا ہوگا، خود ان کے عمل کا ثواب اتنا زیادہ ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، پھر ساری امت کے اعمال کے ثواب کے برابر بطورِ مزید اُن کو ملے گا، کیونکہ سب اصلاً ان ہی کی دعوت کا نتیجہ ہے۔

لیکن دعوت کا کام ایک طرف تو بڑے اجر وثواب کا کام ہے، دوسری طرف یہ کام بڑی دانائی، حکمتِ عملی اور نفس کشی کا کام ہے اس کام کے ساتھ خود اپنے کو بھی معیار صلاح واحتیاط پر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ بے عمل کی

دعوت کا اثر مدعو پر بہت کم پڑتا ہے، اور اسی طرح مدعو کے حالات و مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے حکمت و موقع و محل کا لحاظ کر کے بات کرنا ہوتی ہے، اس سلسلہ میں اپنی راحت و پسند کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے، ان باتوں کی رعایت کرنے پر بعض وقت بغیر کچھ کہے بھی اثر پڑ جاتا ہے، بعض وقت صاف طریقہ سے بات کہنے کے لئے مناسب وقت کے انتظار میں بڑا صبر کرنا پڑتا ہے اور نصیحت کرنے پر سخت وسست بھی سننا پڑتا ہے اور اس کو جھیلنا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ کام مشکل اور مجاہدہ کا کام بن جاتا ہے، لیکن اس کے لئے جو اجر بیان کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اس کا دھیان کرنے پر ساری زحمت کافور ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کو خیر و صلاح کی طرف دعوت دینے میں اتنی زحمت و حکمت کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی غیر مسلموں کو حق کی راہ پر لانے میں ہوتی ہے، وہاں اس کام میں زیادہ حکمتِ عملی، خوش اخلاقی اور موقع و محل کے لحاظ کی ضرورت ہوتی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے نو سو پچاس سال محنت کی اور توجہ و برداشت کے ساتھ کام میں لگے رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دہائی سے زیادہ وقت اس کام میں صرف کیا، طرح طرح کی ایذا رسانی برداشت کرنا پڑی، لیکن بہت دردمندی اور بُردباری کے ساتھ کام میں لگے رہے، آپ ﷺ پر گندگی پھینکی گئی مگر آپ ﷺ مشتعل نہیں ہوئے، آپ ﷺ کو پاگل، جادوگر اور مفسِد کہا جاتا اور آپ ﷺ صابر و سکون کے ساتھ سب سنتے اور نظر انداز کرتے، پھر مستزاد یہ کہ کہنے والے خاندان کے ہی لوگ تھے، اور آپ ﷺ خاندانی عزت و اثر میں ان کہنے والوں سے کم بھی نہیں تھے، اگر چاہتے تو سخت جواب دیتے اور دانت کھٹے کر دیتے، لیکن آپ ﷺ نے دعوت کی مصلحت کی خاطر برداشت کیا، اور جب بھی موقع مناسب پایا بڑے سے بڑے

مخالف سے مل کر بہت خوش اسلوبی سے بات کہی لیکن آخر میں جب اِن اعزہ و اقارب نے مکہ میں آپ ﷺ کا رہنا بھی مشکل بنا دیا تو اپنے پروردگار کی اجازت وحکم سے ہجرت فرمائی، اور مکہ چھوڑتے ہوئے وطن عزیز کو خیر باد کہنے کا جو اثر طبیعت پر ہوتا ہے وہ برداشت کیا، جو آپ ﷺ کے اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے جو آپؐ نے وطن چھوڑتے ہوئے فرمایا کہ ''اے مکہ ہم تم کو نہ چھوڑتے لیکن تمہارے رہنے والوں نے ہم کو رہنے نہیں دیا'' مکہ آپ ﷺ کا صرف وطن ہی نہ تھا بلکہ کعبہ کی وجہ سے قلب ودماغ کا مرکز بھی تھا لیکن دعوت دین کی خاطر آپ ﷺ نے اس کو چھوڑا، کوئی کشمکش نہیں کی، اور نہ انتقام لینے کو سوچا، کیونکہ اس سے دعوت کا کام متاثر ہوتا، پھر مدینہ جاکر چند برس کی جدوجہد کے بعد صلح حدیبیہ یعنی نفس کشی کا کام کیا تا کہ دشمنوں کی دشمنی کچھ دنوں کے لئے موقوف کرسکیں، اور اس طرح مسلمانوں کی دین کی دعوت پُرسکون اور آپسی ہمدردی کے ماحول میں پیش کرسکیں، چنانچہ اس کا غیر معمولی اثر پڑا کہ ان دو سالوں میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے وہ اس سے قبل کی ساری مدت میں مسلمان ہونے والوں سے زیادہ تھے۔

جب معاشرہ مشترک طرز زندگی کا ہو، اور اقتدار اور حکومت کا اس سلسلہ میں مفید کردار ہو تو صرف محبت و ہمدردی اور دل سوزی ہی ذریعہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی اعلیٰ مثالیں ہیں، حق سے روگرداں لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سرے سے مذہب ہی کو نہیں مانتے جن کو دینی اصطلاح میں مُلحِد کہا جاتا ہے، ان کو حق کی طرف مائل کرنے کے لئے مذہب کی خوبیوں اور برکتوں اور نعمتوں سے روشناس کرانا ہوتا ہے، ان کو بتانا ہوتا ہے کہ تم میں بے خدا ہونے کی صورت میں زندگی کس قدر خشک اور بے مزہ ہوجاتی ہے اور سکونِ قلب سے کس قدر دور ہوتی ہے ملحد کو ترغیب دینا ہے کہ وہ مذہب کے تسکین بخش ہونے کی

صفت کا تجربہ تو کر کے دیکھے، ذرا اس کو سمجھنے کی کوشش تو کرے، دوسری طرف کے روگرداں اشخاص وہ ہوتے ہیں جو مذہب کو تو مانتے ہیں اور خدا کو بھی مانتے ہیں لیکن راہِ حق و دینِ صحیح سے منحرف ہوتے ہیں وہ آخری نبی اور آخری دین کو نہ ماننے کی وجہ سے ان کو مانتے نہیں ہیں خدائے واحد پر انحصار ان کے مذہب میں نہیں ہوتا ایسے اشخاص کو دینِ حق سے قریب لانے کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وہ قریب ہو کر دینِ حق کا توحید و رسالت کا مطالعہ کر سکیں، اور اس کی خوبی کو سمجھ سکیں، ایسے اشخاص کے ساتھ محبت سے پیش آنا ہوتا ہے اور حسنِ سیرت سے ان کو اپنے سے قریب کرنا ہوتا ہے، ان سے ایمان کی بات بتانا ہوتی ہے ایمان کی دعوت دینا ہوتی ہے، ایمان وہ جملۂ حق ہے جو ہر مذہب کا ماننے والا سنتا اور دھیان دیتا ہے اس لئے کسی بھی شخص سے ایمان کے حوالہ سے بات کہی جا سکتی ہے وہ اس کو آسانی سے سنے گا اور اگر اس کے دل کو یہ بات چھو گئی تو اس سے متاثر ہوگا، ایمان کا تعلق دل سے ہے دلائل و حجت کا تعلق عقل سے ہے، عقل خوب پینترے جانتی ہے، اس کو شکست دینا آسان نہیں ہوتا لیکن دل کو جب بات اچھی لگ جائے تو دل مائل ہو جاتا ہے وہ دلائل کے چکر میں زیادہ نہیں پڑتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کفار کے سامنے بات رکھی تو خالق اور پروردگار کو ایک ماننے کی بات رکھی اور انسانوں کے ساتھ ہمدردی، مظلوموں کی مدد، مہمان کی خاطر داری مسافر کی مدد، جیسے کاموں کی تلقین کی، اور اس کی دعوت دی یہ وہ حکمت اور طریقہ تھا جو دلوں کو جلد متاثر کرتا ہے، غیر مسلموں کو قریب کرنے کے لئے اس کی نقل کی جا سکتی ہے، ہمدردی و انسانیت نوازی اور ایمان باللہ وحدہ، ایمان بالرسول وخاتم المرسلین کو ملانے سے وہ عظیم دعوت بن جاتی ہے جس میں ایک خاص برکت اور تاثیر ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کی پیروی ہے جو آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران اختیار

فرمائی تھی، آپ ﷺ کو ایذائیں دی گئیں لیکن آپ نے صبر کیا، سخت سست کہا گیا لیکن آپ ﷺ نے برداشت کیا اور اخلاق ومحبت کے ساتھ ہمدردی اور حکمت کے ساتھ کام جاری رکھا اور ایک ایک کر کے لوگ متأثر ہوتے گئے، اور جس نے اثر لیا وہ آپ ﷺ کا گرویدہ ہوگیا، دراصل دعوت کے کام میں مدعو کے دل میں اثرات کی ضرورت ہوتی ہے اپنے کو اس کا خیر خواہ اور مخلص محسوس کرانے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ انسان اپنے مخلص وخیر خواہ کی بات سنتا ہے اور جس کو وہ مخلص وخیر خواہ نہ سمجھے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام کے سلسلہ میں جو ہدایات یا وضاحتیں فرمائی ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کام خیر خواہی کے جذبہ کے بغیر نہیں ہوسکتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خیر خواہی اتنی محسوس کرائی ہے کہ حیرت ہوجاتی ہے، عبداللہ بن ابی اپنے قبیلہ خزرج کا بڑا مقبول سردار رہ چکا تھا، قبیلہ کے ساتھ وہ بھی اسلام لایا، لیکن اسلام اس کے حلق سے نہیں اترا تھا، وہ اپنے کو مسلمان ثابت کرتا لیکن اندر اندر دشمنی کرتا، ظاہر میں مسلمان ہوگیا تھا اس سے اس کا قبیلہ اس سے ہمدردی رکھتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی رعایت میں یہ جانتے ہوئے کہ وہ منافق ہے بلکہ اس کی طرف سے آپ ﷺ کو وقتاً فوقتاً سخت ایذا پہنچتی تھی لیکن اچھا برتاؤ رکھا، بلکہ ایک سفر کے دوران عبداللہ ابن ابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کی طرف آتے ہوئے مسلمانوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ مدینہ پہنچ کر مدینہ کے معزز لوگ اِن گھٹیا اور ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے، جس کا صاف مطلب تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مہاجرین کے لئے وہ کہہ رہا ہے، یہ ایسی بات تھی کہ خود عبداللہ ابن ابی کے بیٹے کو بری لگی ان کو یہ خیال ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس باغیانہ حرکت پر ان کے

باپ کو سخت سے سخت سزا دے سکتے ہیں، یا خود مسلمان ناراض ہوکر اس کو قتل کر سکتے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے باپ نے ایسی گندی بات کہی ہے اس پر وہ لائقِ قتل ہو سکتے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ قتل کا کام اگر کوئی مسلمان کرے گا تو میں انسان ہوں فرزند ہونے کے ناطے مجھ پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے جو میرے ایمان کے لئے مضر ہوگا لہٰذا یہ کام لینا ہو تو مجھ سے ہی لے لیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کروں گا، آپ ﷺ کے اس عمل کا ایسا اثر پڑا کہ جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا یہ قافلہ داخل ہوا تو عبداللہ بن ابی کے بیٹے راستہ پر کھڑے ہوگئے اور باپ کی آمد پر تلوار دکھا کر کہا سن لیجئے، معزز و موقر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ہیں اور ذلیل اور پست آپ ہیں، اب سن لیجئے آپ مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر داخل بھی نہیں ہو سکتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وعدہ کو برابر نبھایا کہ عبداللہ بن ابی کے ساتھ تاحیات خوش اخلاقی کا ہی معاملہ رکھا، خوش اخلاقی اختیار کرنے کے سلسلہ میں قرآن کی ہدایت یہاں تک آئی کہ اگر کوئی مشرک تمہاری حفاظت میں آئے تو اس کو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس ٹھہراؤ، اس طرح اللہ کا کلام سنے گا پھر اس کو اس کی حفاظت کی جگہ تک پہنچا دو۔

صوفیائے کرام علمائے ربانی اور بزرگانِ دین نے دعوت کی خاطر احکامِ خداوندی اور اسوۂ نبوت کو پوری طرح اختیار کیا، اسی کا اثر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہے، اس سلسلہ میں ان کے بے شمار واقعات ہیں جن سے ان کی محنت، وصبر و برداشت، عام انسانی ہمدردی خیر خواہی، دوستوں کے ساتھ اخلاص و محبت دشمنوں کے ساتھ بھی رعایت و خیر خواہی کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں، یہ وہ

طریقۂ عمل ہے جس سے دین تو دین ہے دنیا بھی عافیت وخیر کی بن جاتی ہے، چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

بادوستاں تلطف ، با دشمناں مدار

نبی اکرم ﷺ کا طریقۂ دعوت وتبلیغ

اور عصری تحریکات

مسلمان داعیوں کے لئے کامل ومکمل نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے طریقۂ کار کو مصالحانہ رکھا، اور سختی وٹکراؤ کا رویہ اسی وقت اختیار کیا جب مخالفوں نے سختی کا جواب سختی سے دینے پر مجبور کر دیا، آپ ﷺ نے اسلام کی صلح پسند تصویر کو اپنے نرم خورویہ سے ظاہر کیا جس میں اخلاص وخیر خواہی کا جذبہ صاف ظاہر ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرصۂ دراز تک کریم النفسی کے ساتھ صبر کیا، مسلمان بھی آپ ﷺ کے ساتھ ظلم وزیادتی اور ذلت ورسوائی اور دیگر مصائب سے دوچار ہوئے، حتیٰ کہ اس کا تذکرہ صحابۂ کرامؓ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، جیسا کہ حضرت ابوعبداللہ بن خبّاب بن ارت ﷺ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے فریاد کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت چادر کا تکیہ بنائے ہوئے تھے اور ہمارا حال یہ تھا کہ مشرکین کے سخت مظالم سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا، تو ہم نے عرض کیا کہ کیا آپ ﷺ ہمارے لئے ایسی صورت میں مدد نہیں چاہیں گے اور دعا نہیں کریں گے، تو آپ ﷺ

نے فرمایا، پچھلی امتوں کے کسی فرد کو پکڑا جاتا اور اس کے لئے گڈھا کھودا جاتا، پھر اس میں ڈال دیا جاتا، پھر آری اس کے سر پر رکھ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے، اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا سر چھیدا جاتا، تو صرف گوشت اور ہڈی باقی رہ جاتی اور یہ چیز اس کو دین سے نہیں روک پاتی تھی، "خدائے ذوالجلال کی قسم اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اللہ کے سوا وہ کسی کا خوف محسوس نہیں کرے گا، حتیٰ کہ چرواہے کو اپنی بکریوں پر کسی بھیڑیے کا ڈر نہ ہوگا، لیکن تم عجلت بازی سے کام لیتے ہو۔"

(بخاری شریف)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ کار کا دوسرا نمونہ اسی سے متعلق یہ ہے کہ آپ نے مقام حدیبیہ میں صلح و مصالحت قائم کرنے کا وہ اہم فریضہ انجام دیا، جس کی وجہ سے ساری کشمکش ختم ہوگئی جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد ہی سے کفار اور مسلمانوں کے مابین جاری تھی، اور دونوں میں ایسی صلح ہوئی جس نے مسلمانوں کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ اسلام کی فطری تصویر کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کریں، اور کفار کے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ وہ لوگ اس تشدد سے دور رہ کر جس کا لازمی نتیجہ اختلاف اور جنگ کی سیاست تھا، اسلام کا بغور مطالعہ کریں، اسی وجہ سے صلح کے دو سالہ عرصہ میں اسلام کے مخالفین کو اسلامی زندگی کی انسانیت نوازی و کریمانہ اخلاق کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اس کے بعد میں وہ اسلام میں اتنی تعداد میں داخل ہوئے جتنے اس سے پہلے کی پوری مدت میں بھی نہیں ہوئے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ نرم مصالحانہ طریقۂ کار عصر حاضر میں دعوت و تبلیغ کے کام کا بہترین نمونہ ہے، جو حقیقی اسلام سے بُعد کے سبب اس جاہلی دور کے مشابہ ہے، جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے اہل عرب کو دعوتِ اسلام

پیش کی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمان داعیوں نے عہد اول ہی میں جو آپ کی بعثت سے سترہ سال کی مدت پر محیط ہے قسم قسم کے مصائب ومشکلات کا سامنا کیا، لیکن ان حضرات نے اسلامی دعوت کی مصالحانہ روش کو باقی رکھا، اس مسئلہ کو سیاست وقیادت اور جدال وانتقام کا مسئلہ نہیں بنایا، کیونکہ انتہائی مقابلہ آرائی کا طریقۂ کار ایک ایسا طریقۂ کار ہے جو اپنی فلاح ونجات کے لئے عموماً مکر وفریب حیلہ سازی وچالبازی کے ذرائع کے استعمال کا متقاضی ہے، اور جب بھی کوئی اس طرز کو اختیار کرے گا، اور اس پر کسی بھی دعوت کی بنیاد رکھے گا تو جاہلوں اور اس کی حقیقت سے ناآشنا لوگوں میں یہ دعوت ایک سیاسی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوگی، جس کا بانی اور اس کا قائد اچھے برے کسی بھی حیلہ وتدبیر سے غلبہ واقتدار کو پہنچنا چاہتا ہے، اور وہ سمجھیں گے کہ یہ اسی غلبہ واقتدار کی لالچ اور حرص کی بنا پر ہے، جو اس کے خواہش مند حضرات کے دلوں میں جنم لیتی ہے، یا جاہ ومنصب، مال ودولت اور سلطنت وحکومت حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے، یہ وہ چیز ہے جو انسانی خمیر اور جبلت میں داخل ہے، اور اسی کا گمان عام حالتوں میں لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے، یہ صورت حال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی پیش آئی کہ ایک دن عتبہ بن ربیعہ نے کہا جو اپنی قوم کا سردار تھا اور قریش کی محفل میں حاضر تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ خدا میں تنہا تھے، اس نے کہا: اے قریشیو! کیوں نہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں اور ان سے بات کروں اور ان کے سامنے چند باتیں پیش کروں، شاید کہ ان میں سے بعض کو قبول کرلیں، تو ہم ان کی خواہش کے مطابق ان کو عطا کردیں، تاکہ وہ اور ہم دونوں آرام سے رہیں، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جلد ہی حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے اور کفار

قریش نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے متبعین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے، تو انھوں نے کہا: کیوں نہیں، ضرور بالضرور، ابوالولید! ان کے پاس جاؤ، اور ان سے بات کرو، لہٰذا وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ ﷺ کے قریب بیٹھا، اور کہا، بھتیجے! تمہیں جو خاندانی برتری اور عالی نسبی حاصل ہے اس سے تم اچھی طرح واقف ہو، اپنی قوم کے پاس ایک ایسا معاملہ لے کر آئے ہو جس سے تم نے ان کی جماعت کو منتشر کردیا ہے، اور ان کے عقل مندوں کو کم عقل ٹھہرایا اور ان کے معبودوں اور ان کے دین کی تحقیر وتذلیل کی ہے اور تم نے اسی کی وجہ سے ان کے پرکھوں اور اسلام کی تکفیر کی ہے تو میری سنو! میں تمہارے سامنے چند امور رکھتا ہوں تم اس کے تئیں غور کرلو، شاید کہ بعض کو قبول کرلو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوالولید! جو کچھ کہنا ہے کہو، میں ہمہ تن گوش ہوں، تو اس نے کہا، بھتیجے! اگر تمہیں اپنے لائے ہوئے دین کے بدلے مال کی خواہش ہے تو ہم تمہارے سامنے مال کا ڈھیر لگادیں گے حتی کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہوجاؤ گے، اور اگر تم عزت وسرداری کے خواہاں ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنالیں گے، حتی کہ کوئی فیصلہ بھی بغیر تمہارے طے نہیں کریں گے، اور اگر تمہیں بادشاہت کی تمنا ہے تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنالیں گے، اور اگر کسی جنون کی وجہ سے یہ سودا سوار ہے، جس کا ازالہ نہیں کرسکتے تو ہم تمہارے لئے علاج ومعالجہ کی تدبیر کریں گے، اور ہم اپنے اموال کو اس میں بے دریغ صرف کریں گے، حتیٰ کہ تم اس سے صحت یاب ہوجاؤ، کیونکہ کبھی کبھی انسان کا مؤکل جن خود اس پر سوار ہوجاتا ہے جب تک اس کا علاج نہ کرایا جائے اور اسی جیسی دیگر باتیں کہیں، جب عتبہ اپنی بات سے فارغ ہوا جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غور سے سن رہے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ابوالولید! کیا تم اپنی بات کہہ چکے ہو، اس نے کہا جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اب میری سنو! اس نے کہا فرمایئے، میں

سن رہا ہوں تو آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

"حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُه قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" (حٰم سجدہ:۱-۳)

''حامیم۔ اتارا ہوا ہے بڑے مہربان رحم والے کی طرف سے۔
ایک کتاب ہے کہ جدا جدا کی ہیں اس کی آیتیں قرآن عربی
زبان کا ایک سمجھ والے لوگوں کو''

یہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوت واصلاح کے میدان میں ہمارے لئے اسوہ جس کے حیرت انگیز نتائج سامنے آئے اسی لئے صلح حدیبیہ میں جتنی بڑی تعداد مشرکین کی اسلام لائی وہ اس سے پہلے نہیں لائی تھی اس لئے کہ اس سے پہلے مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت صحابہؓ کو اتنا قریب سے زندگی گزارتے ہوئے اور معاملہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بعد میں بھی جب جب مسلمانوں نے یہ طریقہ کار اپنایا، اور اس اسوۂ نبوی کو سامنے رکھا تو انقلاب پیدا کردینے والے واقعات رونما ہوئے دشمن دوست بن گئے اور حملہ آور اسلامی سرحدوں کے محافظ و امین بن گئے لیکن ہمارے سامنے بہت سی ایسی دعوتیں اور تحریکیں ہیں جنھوں نے ابتدا ہی سے تشدد و ٹکراؤ والی سیاست اپنائی تو وہ لوگوں کو باور کرانے میں ناکام رہیں کہ وہ دعوت خیر ہیں، اور وہ لوگوں میں حق وانصاف، نیکی اور بھلائی کو پھیلانا چاہتی ہیں، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان دعوتوں کی تاریخ میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے، جس میں ان کے قائدین اور متبعین نے اچھے کاموں اور انسانی خدمات اور مخلصانہ جدوجہد سے ایک طویل زمانے تک اخلاق وصفاتِ عالیہ سے اپنے کو متصف رکھا، حتی کہ انھیں عوام الناس میں اپنی اچھی نیتوں اور خیر خواہی کی وجہ سے اچھی شہرت ملی۔

لیکن ہم اس کی بہت ساری مثالیں تاریخ اسلام میں پاتے ہیں، جس کے وہ ممالک گواہ ہیں جن پر مسلمانوں نے خاص جنگی طریقہ پر یورش کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ممالک مخلصانہ طور پر ان کے تابع نہیں ہوئے، بلکہ جب بھی مسلمانوں کی مادی طاقت کمزور پڑی تو ان کے خلاف ایک نہ ایک دن صورتحال پلٹ گئی، البتہ یہ ضرور ہوا کہ ایسی حکومت میں صحیح طریقہ کار کے مخلص اور اہل صلاح وتقویٰ نے اچھے اخلاق کا ثبوت دیا اور انسانی فضائل ومکارم کو دلوں اور جانوں سے قریب کرنے کا کام لوگوں کے ساتھ اپنی محبت اور پاکیزہ واچھی سیرت وکردار سے کرتے رہے، اور انھوں نے سب کے لئے بھلائی اور خیر خواہی چاہی، اور اسلامی خوبیوں کو سمجھنے اور ان کی جانب آنے والے لوگوں کو مائل کرنے کی انتھک کوشش کرتے رہے، اور اسے اپنی محبت وخیر خواہی اور احسان والی مثالی زندگی سے ثابت کرتے رہے، یہی وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کی مفتوح قوم کی انسانی ہمدردی وخیر خواہی کے رویہ کے ساتھ حفاظت کرتے ہیں، اور اسلامی حکومت کی پوری تاریخ میں اسلام سے بیزار ہو رہے لوگوں نے اپنے دلوں میں مسلمان حکمرانوں کی جانب سے پائی جانے والی مخالفت کے باوجود اسلام قبول کیا، اور ملک کے عوام ان مخلص حضرات کی کوششوں سے ایک نئی دینی جماعت میں بدل گئے، جس کی وجہ سے حاکم ومحکوم میں دوری ختم ہو جاتی ہے اور حکومت ہر ایک کی اپنی ہوتی ہے نہ کوئی حاکم ہوتا ہے اور نہ کوئی محکوم۔

اس اہم طریقۂ کار کی کمی کا مشاہدہ ہم اسپین کی تاریخ میں کرتے ہیں، جہاں مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی، لیکن اس ملک کے عوام کو تبدیل نہ کر سکے، اور نہ انھیں کوئی ایسا فرد ہی ملا جو ایسا کرتا، اس طرح وہاں کے باشندوں کی اکثریت اسلام سے دور رہی، پھر جب دشمن کا فوجی محاذ طاقتور ہو گیا تو وہ اس ملک کو اس کی پہلی حالت یعنی مسیحی مذہب پر لے آئے، اور مسلمانوں کو ملک سے نکال دیا۔

برصغیر کی صورت حال اندلس سے بڑی حد تک مختلف ہے، کیونکہ یہاں مسلمانوں کی حکومت کے آغاز ہی سے داعیوں اور مصلحین نے جو اسلامی لشکر کے ساتھ رہے یا اس کے بہت بعد آئے، ہندوستانی گمراہ مفتوح معاشروں میں سیاسی طور پر سرایت کرنا شروع کیا، اور انھوں نے اسلام کی رحیمانہ زندگی کی نمائندگی کر کے اس معاشرہ کو بدل ڈالا، چنانچہ انھوں نے رفتہ رفتہ فرزندانِ وطن کی بڑی تعداد کو حسن سلوک اور اسلامی سیرت و کردار کی اثر انگیزی سے اسلام کی جانب مائل کیا، یہی لوگ ہندوستان میں فرزندانِ اسلام کی کثرت کا سب سے بڑا اور اولین سبب تھے، حتیٰ کہ برصغیر کے بعض علاقے خالص اسلامی شہروں میں تبدیل ہو گئے، جیسے پنجاب، سندھ، بلوچستان، کشمیر اور بنگلہ دیش کے علاقے، آج بھی مسلمان ان علاقوں میں بھاری اکثریت میں ہیں، جن کی تعداد تقریباً تیس کروڑ سے زائد ہے، اگر ہم ان لوگوں کے اسلام کا دقیقہ رسی اور بالغ نظری سے جائزہ لیں تو ہم ان کی تاریخ کو انھیں داعیوں اور علماء کی محنتوں اور کاوشوں سے لبریز پائیں گے، نہ کہ بادشاہوں اور مسلمان حکمرانوں کی کوشش سے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جنگی مقابلے یا سیاسی یورش یا حکومت کی اسلام میں کوئی قدر و قیمت اور اہمیت نہیں ہے لیکن وہ دلوں کی اصلاح اور خیر کو عام کرنے کے لئے اخلاقی کوششوں کے ذریعہ بطور سند ظہور میں آتے ہیں، اسی وجہ سے اسلامی جہاد کی کارگذاریوں میں اس کے علاوہ اور کسی بات کی گنجائش نہیں کہ پہلے پہل دشمنوں کو دین کی دعوت دی جائے، اگر وہ اسے قبول کر لیتے ہیں تو ان کے جان و مال حرام ہیں اور وہ لوگ اپنے ذاتی اختیار کی بقاء کے مستحق ہو جائیں گے اور جب اس کا انکار کریں تو ان سے اسلام اور مسلمانوں کی ذمہ داری میں داخل ہو جانے کا مطالبہ کیا جائے گا، اس طرح مسلمان داعیوں کے لئے ان میں بغیر کسی جبر و اکراہ

اور ظلم کے دعوت کا کام کرنے کا موقع مل جائے گا، لیکن جب وہ لوگ اس کا بھی انکار کر دیں تو پھر جہاد کا حکم ہے، اور ان سے جنگ کی جائے گی، یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں، یا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں، یہی اسلامی طریقہ ہے۔

آج کی مسیحی دنیا اپنے ملحدانہ مادی نظام حیات سے تنگ آچکی ہے، کیونکہ وہ نرم انسانی جذبہ سے خالی ہے اور مسیحی مذہب سے اس کا ربط ٹوٹ چکا ہے، اس لئے کہ اس میں اب کسی دینی خلا کو پر کرنے کی استعداد نہیں رہی لہٰذا وہ حیران و پریشان کسی نئے دین کی تلاش میں ہے جو اسے زندگی کی بھول بھلیوں سے نکال کر منزل کی صحیح رہنمائی کرے، اور اس کی استعداد اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔

لیکن آج ہمارے کچھ افراد اسلام کو غیروں کے سامنے بھلائی اور نیکی سے ہٹ کر خود غرضی اور نفرت کے طرز عمل کے طور پر پیش کر رہے ہیں، اور جب تک ہم اسلام کا چہرہ نفرت اور معاندانہ طرز پر مغرب کے سامنے پیش کرتے رہیں گے ہم مغرب سے اس کا جواب اعراض اور روگردانی کے سوا کچھ نہیں پائیں گے، ایسے حالات میں یہ لازم ہے کہ ہم اسلام کو مغرب کے سامنے ایک ایسے حکیمانہ انداز میں پیش کریں جو اس کی موجودہ زندگی کو اجتماعی اور اخلاقی زوال سے چھڑا سکے، کیونکہ مغرب زدہ لوگوں کی طبیعت اس سے اکتا چکی ہے، اور وہ اس سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتی ہے، چنانچہ وہ اپنے ان پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں حیران و پریشان ہے۔

لہٰذا ایسی صورت میں غیر مسلم کے سامنے اسلام کا روشن چہرہ ظاہر نہ کیا گیا تو پھر اسلام ان کے دلوں کو اپنی جانب لانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور یہ دنیا اسی طرح در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی، اور ایسی چیزوں کا سہارا لے گی جس کو اپنے درد کا درماں سمجھ بیٹھے گی، اور اس کی سیکڑوں مثالیں ہمیں ملتی ہیں، اس لئے مسلمان داعیوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلامی دعوت کے لئے مناسب و درست

طریقہ اختیار کریں کیونکہ دعوت کا کام انہی سے مربوط ہے خدائے وحدہ لاشریک کا ارشاد گرامی ہے:

"کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تَأمُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنھَونَ عَنِ المُنکَرِ وَتُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ"

"تم ہی لوگ بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالے گئے ہو، نیکی کی ہدایت کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

لیکن آج اسلام کے نقش قدم پر چلنے والے لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں، کچھ تو وہ ہیں جو اسلام کے صرف نظریۂ جنگ وجدال کو مانتے ہیں اس سلسلے میں صرف عملی اظہار پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اسکو اسلام کی اولین اساس و بنیاد بناتے ہیں، وہ ایسا کرتے وقت رسول اکرم ﷺ کی سیرت و کردار اور طریقۂ کار کو نہیں دیکھتے، وہ حضور اکرم ﷺ کے اس طرز عمل کو نہیں دیکھتے کہ آپ ﷺ نے بعض منافقین کے نفاق کو اچھی طرح جان لینے کے بعد بھی ان کو قتل کرنے سے احتراز کیا کہ وہ کفار کے مقابلے میں جانی دشمن ہیں اور آپ ﷺ نے خالص اسلام کی مصلحت میں یہ کیا کہ دشمنانِ اسلام کو کھلے طور پر یہ موقع ہاتھ نہ آجائے، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی شخص کو قتل کر دیا، اسی وجہ سے آپ ﷺ اسلام کو بدنام ہونے سے بچاتے تھے، اور آپ ﷺ کے سامنے کوئی لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتا تو آپ ﷺ اس کا اعتبار کرتے، ایک صحابیؓ کو اس بات کی خلاف ورزی کرنے پر زجر و توبیخ کرتے ہوئے فرمایا "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا ہے۔"

دوسرا گروہ اسلام کو صرف عقلی نقطۂ نظر سے پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہے، اور اسے مغربی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ بنانے پر اپنی محنت صرف کر رہا ہے، جبکہ مغرب خود اس طرز زندگی سے بیزار ہو رہا ہے، اس لئے کہ اب اس کو اس میں قلبی

راحت اور زندگی کا سکون میسر نہیں رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے افراد وقتاً فوقتاً اس زمانے سے منہ موڑ کر زندگی کے عام وسائل راحت کو بھی چھوڑ کر تارک الدنیا شخص کی زندگی اپنانے لگتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مغرب نے خوب ترقی کی، وہ سیاسی اور اقتصادی نظام اور عسکری قوت وسائل معیشت اور تمدنی ارتقاء میں اوج ثریا تک پہنچ گیا ہے، اس کے ذریعہ اس نے انسانی مشکلات حل کرنے اور ذاتی رنج والم کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہر کوشش صدا بصحرا ثابت ہوئی، آج مغربی نوجوان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مسائل کے حل کی تلاش میں ہر وادی کی خاک چھان رہا ہے، اور ہر جگہ سے ناکام اور نامراد لوٹ رہا ہے، یہ اخلاقی ابتری اور ذہنی کشمکش جس کا آج مغربی نوجوان شکار ہے یہ اس معاشرے کا نتیجہ ہے جو اخلاقی اور دینی پابندیوں سے یکسر خالی اور آزاد ہے، اور یہی ان کی بیماری کی اصل جڑ اور بنیاد ہے، ایسے میں مغرب کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور خاص طور پر خاتم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہے، جن کی دعوت یہ ہے کہ خالق کائنات سے اور تعلق پیدا کیا جائے اور اعتدال وتوازن کے ساتھ اسباب زندگی اختیار کئے جائیں، جن کا موقف یہ ہے کہ سامان راحت اور اسباب زندگی پر نہ ٹوٹ پڑا جائے اور نہ رہبانیت ہی اختیار کر کے ضروریات زندگی سے منہ موڑ لیا جائے، ارشاد خداوندی ہے:

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ، قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ" (سورہ اعراف:۳۲)

"اے محمدؐ! آپ کہہ دیجئے کس نے حرام کرایا اللہ کی زینت کو جو اس

نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور ستھری چیزیں کھانے کی،
آپ کہہ دیجئے، یہ نعمتیں اصل میں ایمان والوں کے واسطے دنیاوی
زندگی میں اور خالص انہی کے لئے ہیں قیامت کے دن"۔

دنیاوی زندگی کے تعلق سے صحیح رائے یہی ہے کہ اس کے بارے میں یہ مانا جائے کہ یہ ایک محدود اور ختم ہونے والی زندگی اور دھوکہ کا سامان ہے، لہٰذا بھلائی اور خیر اسی میں ہے کہ اس کو اعتدال کے ساتھ لیا جائے اور دل کو اس طرح نہ باندھ دیا جائے کہ اس کا کھولنا مشکل ہو۔

آج مغرب اپنے موجودہ صنعتی اور سیاسی نظام کو چھوڑ کر نئے نظام کی خواہش نہیں رکھتا، اسی لئے کہ اس نے اعلیٰ قسم کے نظامہائے حیات کا تجربہ کرلیا ہے، اور اس کا علم، تحقیق اور فراست انتہا کو پہنچ چکی ہے، لہٰذا وہ مزید کسی نئے نظامِ حیات کا خواہش مند نہیں، کیونکہ اسے اس میں اپنے مسائل کا حل نظر نہیں آتا، آج مغرب کے لوگوں کو قلبی چین وسکون کی تلاش ہے جس سے آج انسانی دنیا کا ماحول دیوالیہ ہو چکا ہے۔

لہٰذا حق کے داعیوں کے لئے ضروری ہے کہ اسباب زندگی اور سامان زندگی سے مستفید ہونے اور ان کی حیثیت کی تعیین کے تعلق سے ان کی زندگی اعتدال اور جامعیت کا ایک قابلِ تقلید نمونہ ہو اور اس سلسلے میں علمی تشریح سے زیادہ عملی نمونے مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں، اسی کے ساتھ علمی تشریح کی بھی ضرورت ہے، جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، تو کیا ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی سنت کے عین مطابق اپنی عملی زندگی کے قافلے کو ازسرِ نو بڑھانے کا اقدام کرتے ہیں۔ واللّٰہ من وراء القصد وھو یھدی السبیل(۱)

---

(۱) ترجمہ از عربی: محمد فرمان نیپالی ندوی

سیرت نبوی میں دعوت وسیاست کا امتزاج

اور اس میں ہمارے لئے رہنمائی

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاست ودعوت جنھیں ہم مسلمان ایک امر دینی ہونے کی حیثیت سے اپنی زندگی کے اہم ترین جزو خیال کرتے ہیں، دونوں اپنے اندر حالات کو بدلنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن دونوں کے طریقہ کار جداگانہ اور مختلف ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ داعیانِ اسلام مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دعوت وسیاست کے اسباب ودواعی کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں اور ان کے نشیب وفراز پر گہری نظر رکھیں۔

یہ ہماری سخت غلطی ہوگی اگر ہم معاملہ کی تفتیش، زمانے کے تغیرات اور دعوت وسیاست کے پہلوؤں پر غائرانہ نظر رکھنے کے بجائے صرف خواہشات اور آرزوؤں کے ریگزاروں میں بھٹکتے رہیں اور حالات کے نشیب وفراز سے قطع نظر ان خواہشات کو بروئے کار لانے کے لئے (Shortcut) راستے کی تلاش میں کوشاں و سہل ترین راستے کی جستجو میں سرگرداں رہیں۔

راستہ کتنا ہی طویل ہو اور حالات کتنے ہی نازک ہوں، لیکن دعوت کے طریقۂ کار کو جہدِ مسلسل، عمل پیہم، حکمت عملی اور حسن اخلاق کے خطوط ہی پر منظّم کرنا

ہوگا، لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ بدلتے ہوئے حالات پر گہری نظر رکھی جائے، ایسی اسکیم بنائی جائے جو وقت نظر اور سلامت فکر کی حامل ہو اور جو حالات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہی اپنے طریقۂ کار کو اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہو، آپ معرکۂ جنگ میں دیکھتے ہیں کہ ''الحرب خدعة'' کے پیش نظر دیگر چیزوں کے مقابلہ میں دشمنوں کی اسکیم اور پلان پر گہری نظر رکھنی ہوتی ہے، اسی بنا پر ذکاوت و ذہانت اور فہم و فراست کی گہرائی سیاست کا اہم ترین عنصر سمجھا جاتا ہے اور بتقاضائے حال کبھی سیاست شعلہ کی شدت اختیار کر لیتی ہے، تو کبھی شبنم کی سی ٹھنڈک سے دشمنوں کے دل جیتنے کی کوشش کی جاتی ہے، کبھی شمشیر و سنان کے زور پر دشمنوں کو جھکنے پر مجبور کیا جاتا ہے، تو کبھی صرف دفاع میں بہتری سمجھی جاتی ہے، اگر بعض وقت رحمت خداوندی شامل حال نہ ہو تو انسان اپنی فطری کمزوری کی بنا پر مادیات کے تیز دھارے میں بہہ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سیاست میں نفسانی رجحانات اور مادی اغراض سے بچنے کے لئے فکری بیداری اور ذاتی تحفظ بہت ضروری ہے۔

اب اگر گذشتہ ادوار میں دینی کوششیں سیاست سے الگ ہوکر صرف دعوت و صبر کے طریقہ کار تک محدود رہی ہیں تو شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ سیاست کے میدان میں کبھی کبھی انسان ذاتی مصالح اور مادی اغراض کے خاروں سے اُلجھ جاتا ہے، چونکہ دعوت و تبلیغ کی تنظیم، جہد مسلسل، صبر پیہم، قوت برداشت اور دعا واخلاص کے خطوط پر ہوتی ہے لہذا نوید قرآنی :

''اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ''

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے

مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی"۔

اسی طرح: •

اِنْ تَكُونُوا تَألَمُونَ فَاِنَّهُمْ يَألَمُونَ كَمَا تَألَمُونَ
وَتَرْجُونَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا يَرْجُونَ"

"اگر تم الم رسیدہ ہو تو وہ بھی الم رسیدہ ہیں جیسے تم الم رسیدہ ہو اور
تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ
لوگ امید نہیں رکھتے"۔

کے پیش نظر اگر منزل مقصود تک رسائی ہوتی ہے تو فبہا ورنہ اجر وثواب کی عطر بیزی سے استفادہ تو یقینی ہے۔

یہی وہ موڑ ہے جہاں دعوت وسیاست کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ تاریخ انسانی میں پہلی بار اسلام نے دعوت وسیاست کو میدان عمل کے گلدان میں سجا کر دنیا والوں کے سامنے ایک حسین گلدستہ پیش کیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ سیاست ودعوت کا امتزاج تاریخ انسانی میں پہلی بار ہوا جو ایک طرح سے نہایت دشوار ہے، کیونکہ سیاست کی بنیاد صرف حصول منفعت پر ہے اور دعوت کی بنیاد حصول منفعت سے قطع نظر صرف اخلاص پر ہے، اسی وجہ سے اسلام میں سیاست ودعوت کو جدا نہیں کیا گیا، تاریخ بتاتی ہے کہ کئی مرتبہ دانشوران سیاست و رہبران دعوت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے ہیں۔

رہبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے تھے کہ منافقین جو جاں نثاران اسلام اور فدا کارانِ دین کے مال میں حصہ بٹاتے ہیں وہ اسلامی معاشرے کے تناور درخت کی جڑوں کو کھوکھلی اور اسلام کے قلعہ کو زمین بوس کرنے کی ناپاک کوشش کر رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے اصولاً کوئی انتقامی کارروائی

نہیں فرمائی، آخر کیوں؟ اس لئے کہ وہ لوگ آپ ﷺ کے اعزہ میں تھے یا آپ ﷺ کے احباب تھے؟ نہیں بلکہ دعوت اسلامی کا اس وقت یہی تقاضا تھا کہ آپ ﷺ اس وقت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ فرماتے، اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں جو صلح فرمائی جب کہ سیاست کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمان اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے بڑھے چلے جاتے چنانچہ اس وقت صحابہ کرامؓ کو اقدام سے روکنے پر ان کے روحانی جذبات کو سخت ترین دھکا لگا، لیکن چونکہ اسلام میں سیاسی مصالح، دعوتی مصلحت کے دست نگر ہیں اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور انہیں قبول صلح پر آمادہ کرلیا، یہیں پر یہ حقیقت سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی ہے کہ جب سیاست ودعوت کے مابین اتحاد ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ دونوں کے مصالح میں بھی ہم آہنگی پیدا نہ کی جائے۔

آج اس کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمانان عالم اسلامی مشن کے لئے ہمہ گیر اور مکمل طور پر اس طریقہ کو اختیار کریں، جس طرح کہ آج سے پہلے نبی کریم ﷺ، داعیان اسلام اور مجاہدین عظام نے اپنایا تھا، وہ سیاست ودعوت دونوں اصول کے جامع تھے، درحقیقت دعوت وسیاست کے اصول کا نظام ایسا جامع ہے کہ اگر اسلامی معاشرے کی تنظیم اسی خطوط پر کی جائے تو یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ سیاست عین دین ہے، کیوں کہ معاشرے کے لئے اس میں ایسی ہم آہنگی ہے کہ جس کی ظاہری ہار میں بھی جیت کا پہلو نمایاں ہے، اس لئے کہ ہر عمل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ایثار واخلاص ہی پر مبنی ہوتا ہے۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج مسلمانانِ عالم اسوۂ رسول ﷺ کو چھوڑ کر اپنی تمام تر کوششوں کی تنظیم مغرب کے اصول کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ مغرب کے ناقص اصول نے مذہب کو سیاست سے الگ

نکال پھینکا ہے، ان کے نزدیک تو مکروفریب، غداری ودھوکہ دہی، بہانے بازی و حیلہ سازی اور کمائی کے ذرائع تک ہر ممکن کوشش سے پہنچنے اور حالات کے مطابق منصوبہ بدلنے کا نام سیاست ہے، انہیں اس سے مطلب نہیں کہ بھلائی اور خیران سے کوسوں دور ہو جائے، ان کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ ایک شخص اکتساب مال کرنا چاہتا ہے اگر وہ معروف طریقہ سے اس کو حاصل ہو جاتا ہے تو ٹھیک ورنہ وہ چوری، رشوت، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کے ذریعہ مال و دولت جمع کرتا ہے۔

یہی یورپ کی سیاست ہے جسے ہمارے ملک اور ہمارے عوام نے ایک قیمتی تحفہ سمجھ کر قبول کیا ہے لیکن یہ مسئلہ اس وقت بہت ہی بھیانک روپ اختیار کرلے گا جب کہ یہ ہماری دینی اور دعوتی کوشش میں دخل انداز ہوگا۔[1]

---

[1] ترجمہ از عربی مولوی عبدالرشید اورنگ آبادی ندوی

عہد حاضر میں تعلیمات نبویؐ کی ضرورت

پیغمبر اسلام کی تعلیم اور پیغام جس نے آج سے چودہ سو سال قبل انسانی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا آج کی متمدن دنیا کے لیے بھی روشنی کا بڑا مینار ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے ان مسائل اور تقاضوں کے لیے جن سے آج کے انسان کو سامنا ہے ایسی ہدایت عطا فرمائی ہے جن پر عمل کرنے سے اعتدال اور حسن وخوبی کے ساتھ الجھنوں کو دور اور پیچیدگیوں کو بآسانی حل کیا جاسکتا ہے، آپ ﷺ نے موجودہ زندگی کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے ایسے اصول عطا فرمائے ہیں جن کی روشنی میں زندگی کا قافلہ اپنی پیچیدہ راہ کو بآسانی طے کرسکتا ہے جو مساوات، باہمی ہمدردی، نیک نفسی، علم دوستی اور انسانی کمالات وصلاحیتوں سے صحیح استفادہ کی صفات سے مزین ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوت انسانی، مساوات وتعاون اور ہمدردی کے سبق دیئے بڑے چھوٹے کا فرق مٹایا، کمزور طبقات اور عورت کو طاقت اور عزت کا مقام عطا کیا، آپ ﷺ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس کی تاکید فرماتے رہے، آپ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل نصیحت کے جو آخری الفاظ فرمائے ان میں ایک طرف نماز کی پابندی کی تاکید فرمائی جو حق خدا ہے اور دوسری طرف انسانی

ملکیت میں آنے والے انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی جو کہ انسانی اخوت کا عظیم حق ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: الصلوٰۃ و ما ملکت ایمانکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر جبکہ آپ پر ایمان لانے والوں کا سب سے بڑا اجتماع تھا، یہ فرمایا کہ دیکھو شاید اب میں تم سے مل سکوں اس لیے خود بھی سنو اور دوسروں تک پہنچاؤ۔

ہدایات کے اہم نقاط یہ تھے کہ دیکھو تم سب ایک آدمؑ کی نسل سے ہو، خواہ کوئی عرب ہو یا غیر عرب، اگر کوئی کسی سے افضل و برتر ہوگا تو صرف احتیاط و خوف خدا کی بنیاد پر ہوگا، اور دیکھو تم میں سے کسی کا کسی کی جان اور اس کے مال و متاع پر قبضہ کرنا یا ضائع کرنا اس طرح ممنوع اور حرام ہے جس طرح ذی الحجہ کے مقدس مہینہ اور عرفہ کے مقدس دن اور مکہ کے مقدس شہر کی حرمت و تقدس کو نقصان پہنچانا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی عزت و حرمت کو مذہبی عزت و حرمت کا درجہ دے کر اخوت و مساوات انسانی کا وہ عظیم اعلان فرمایا جس کی مثال ماقبل کی تاریخ میں نہیں ملتی، آپ ﷺ شاید اپنی باطنی نگاہوں سے مستقبل کی دنیا اور اس کی ضرورتوں کو دیکھ رہے تھے، لہٰذا آپ ﷺ انسان کو آئندہ کے پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے رہنمائی دے رہے تھے، آپ کالے گورے کی تقسیم ختم کر رہے تھے، انسان کے خود ساختہ چھوٹے بڑے کے پیمانوں کو توڑ رہے تھے، آپ ﷺ نسلی امتیاز کی دیواروں کو گرا رہے تھے، آپ ﷺ عربوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر یہ عظیم، بے غرضانہ اور منصفانہ اعلان کر رہے تھے کہ عرب کو غیر عرب پر کوئی تفوق نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اس میں خدا کا ڈر زیادہ ہو، ایک انسان پر دوسرے انسان کی جان و مال ویسی ہی قابل احترام و لحاظ ہے جیسی مذہبی تقدس کو رکھنے والی کوئی چیز۔

آپ ﷺ نے انسان کو انسان پر حکومت کرنے کا حق صرف اس کی خدا ترس صلاحیت کی بنا پر دیا اور رنگ و نسلی علاقائی تفوق کے پیمانوں کو توڑا، آپ ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا کہ اپنے امیر کی اطاعت کرو خواہ وہ حیثیت کے لحاظ سے غلام اور رنگ کے لحاظ سے کالا ہو، یہ وہ اعلان تھا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور نے دیا ہوتا، اور عربوں کے دل اسلامی طاقت کے سامنے جھک نہ گئے ہوتے تو کہنے والے کی گردن اس کے پہلے لفظ پر اڑا دی جاتی، یہ حقوق انسانی کا پہلا اعلان تھا جو آج کی دنیا میں اور قیامت تک آنے والی قوموں اور نسلوں کے لیے روشنی کا مینار رہے گا، یہ صرف ایک اعلان ہی نہیں تھا بلکہ پوری انسانیت پر ایک احسان تھا، اس کی وجہ سے آپ ﷺ کے ماننے والوں میں مساوات کی غیر معمولی روح پیدا ہوئی اور ان کی حکومتوں کی تاریخ میں ایسے وقفے بار بار آئے آزاد قوموں پر غلام نسل کے لوگوں نے بھی حکومت کی اور ان کی اطاعت سے کسی نے اس بنیاد پر انکار نہیں کیا کہ وہ کم حیثیت کی نسل کے لوگ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں عہد حاضر کے لیے جہاں مساوات انسانی کا یہ عظیم سبق ملتا ہے وہاں مذہب اور زندگی میں مساوات وہم آہنگی کا پیغام بھی ملتا ہے، اور یہ پیغام بھی کہ وہ تاریخی اور عظیم پیغام ہے جس کی مثال ماقبل کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مذہب کے سلسلے میں دنیا میں ہمیشہ یہ تصور رہا ہے کہ وہ صرف عبادت اور دنیا سے بے تعلقی پر مبنی ہے چنانچہ مذہبیت میں ترقی کے خواہش مند کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا رہا ہے کہ وہ دنیا سے حاصل ہونے والی راحت ولطف کی چیزوں سے زیادہ سے زیادہ بے تعلقی اختیار کرے لیکن پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر یہ پیغام دیا کہ دنیا چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ ﷺ نے خدا کا یہ

کلام سنایا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ (سورہ اعراف:۳۲)

جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ جو اچھی چیزیں اور رزق کا سامان اپنے بندوں کے لیے نکالا ہے، اس کو کون حرام کرتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت سنائی ''رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ'' جس میں خدا سے آخرت میں بھلائی اور خوبی مانگنے کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھلائی اور خوبی بھی مانگی گئی ہے اور اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ رہبر انسانیت ہیں جنھوں نے دین کے ساتھ دنیا کو اپنانے اور اختیار کرنے کی دعوت دی، آپ نے دین و دنیا کو اس طرح ملایا کہ نہ تو دنیا کو یہ شکایت کہ اس کی حق تلفی ہوتی ہے اور نہ دین کو نقصان کہ دنیا اس کو کم کرنے کا باعث بن رہی ہے۔

آپ ﷺ نے انسان کو زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتایا وہ انسان کی فطری اور ضروری تقاضوں کی نہ صرف پوری رعایت دیتا ہے بلکہ اس کو شرعی اور مذہبی حیثیت عطا کرتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری ذات کا تم پر حق ہے تمہارے جسم کا تم پر حق ہے، آپ ﷺ نے انسان کا اپنی ذات کے جائز تقاضوں کو پورا کرنا، اپنے جسم کے جائز تقاضوں کو پورا کرنا، اپنے گھر والی اور گھر والوں کے جائز تقاضوں کو پورا کرنا مذہب کا جزء قرار دیا اور وہ عمل جن کو انسان خالص دنیا داری کا عمل سمجھا کرتا تھا اور ان میں سے بعض بعض کو بالکل مذہب کے خلاف سمجھتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق ان میں سے متعدد مذہب کے عمل قرار پائے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اگر اس روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو

نظر آئے گا کہ اس میں وہ تمام ضروری چیزیں ہیں جن سے دین و دنیا کی جامعیت کا پورا ثبوت ملتا ہے، آپ ﷺ کی تعلیمات کی رو سے مذہب زندگی کی مجبوریوں اور ضروری تقاضوں کی صرف رعایت ہی نہیں کرتا بلکہ ان کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے، وہ زندگی سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے غیر ضروری تقاضوں اور رجحانات کو مذہب کی ہدایات کا پابند بنادے، وہ دولت پیدا کرنے کو منع نہیں کرتا صرف اس کے بڑھانے کی ہوس پر روک لگاتا ہے، وہ نفس کے جائز تقاضوں کو پورا کرنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کے حدود بتاتا ہے، گھریلو زندگی اور آپس کے معاملات میں ضابطہ اخلاق متعین کرتا ہے، غرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری انسانیت بلکہ پوری دنیا پر احسان کیا، اس کو ظالمانہ اور محدود طریقہ زندگی سے نجات دلائی جس میں وہ پڑ گئی تھی کہ ایک طرف وہ اہل دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے اندھا دھند فائدہ اٹھانے اور لطف اندوز ہونے میں مست تھے اور دوسری طرف اہل دین تھے جو دنیا کے معمولی بلکہ ضروری منافع سے بھی فائدہ اٹھانا صحیح نہیں سمجھتے تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ ﷺ نے انسان کو مذہب اور دنیاوی زندگی کا ایک مشترک اور جامع نظام عطا کیا جس میں مذہب اور زندگی کے درمیان کوئی تضاد نہ تھا، بلکہ وہ دونوں نہایت خوبی کے ساتھ باہم ایک وحدت بن گئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دو احسانات کہ آپ ﷺ نے انسان انسان کے فرق کو دور کیا اور مذہب اور زندگی کے مابین دوری اور اختلاف کو ختم کیا وہ بڑے احسانات ہیں جن کے ذریعہ انسانیت کو تاریخ کی ظالمانہ اقدار سے نجات ملی، اس کے لیے انسانیت پیغمبر اسلام کی جتنی زیادہ ممنون ہو کم ہے۔

صلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین۔

معاشرہ کی اصلاح میں

حدیث وسنت نبوی سے رہنمائی

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں، جن پر آخری صحیفہ آسمانی نازل ہوا۔ اور جن پر آسمانی احکام اور انسانی زندگی کو سنوارنے والی تعلیمات کو مکمل کیا گیا۔ اور قیامت تک کے لئے اسی کو مکمل شریعت قرار دیا گیا۔

آپ ﷺ پر نازل کیا جانے والا آخری صحیفہ قرآن مجید اور اس کے ساتھ آپ ﷺ کا کلام اور آپ کا عمل جس کو سنت نبوی کہتے ہیں اسلامی شریعت اور دین کا مرجع ومنبع ہیں، انہی دونوں سے دین وشریعت کے سارے احکام لئے جاتے ہیں، اور ان کا ماننا مسلمان رہنے کے لئے لازم اور ضروری ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو اہل ایمان تھے انھوں نے آپ ﷺ کو ایمان کے ساتھ دیکھا اور سمجھا ان کے قول وعمل کو بھی حدیث شریف کے تحت رکھا گیا۔ کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پرتو اور نمونہ تھے۔

اور حدیث شریف اصلاً عام اصطلاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام مبارک ہے جس میں آپ ﷺ نے حکم دیا اور وہ کلام ہے جس میں خود آپ ﷺ کے عمل کا ذکر آیا، یا اپنے صحابی کے عمل کو آپ ﷺ نے دیکھا اور منع نہیں فرمایا۔ اس

طرح یہ بات ثابت ہوئی کہ آپ ﷺ نے کس طرح زندگی گزاری اور آپ ﷺ نے کس طرح معاملہ کیا، اور آپ ﷺ نے کیا طرز اپنایا اور کیا رویہ اختیار فرمایا۔

اس طرح حدیث کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور آپ کا عمل، اور کسی کو عمل کرتے ہوئے دیکھنا اور منع نہ کرنا، اس طرح کی حدیث کے لئے تقریر کا لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات کو ہوتے ہوئے دیکھا اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اچھی تھی، جائز تھی اس لئے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ کسی کام کو ہوتا دیکھا اور اس پر نکیر نہیں فرمائی تو یہ بھی حدیث میں داخل ہے، چنانچہ اس طرح کی حدیث شریف مسلمانوں کے لئے دستور حیات ہے۔

زندگی کا ہر معاملہ، زندگی کا ہر جزء حدیث سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی ہر ایک مسلمان کے لئے معیار ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ کو جو زندگی ملی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات اور براہ راست استفادہ سے جو نورانیت حاصل ہوئی وہ کسی اور کو حاصل نہیں، اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بہتر جماعت روئے زمین پر کوئی نہیں، کوئی خواہ کتنا ہی نیک ہو، صحابیؓ کے برابر نہیں پہنچ سکتا اس لئے صحابہ کرام کو جو حیثیت حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہیں حاصل ہوسکتی۔ انھوں نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو یہ تھا کہ براہ راست آسمان سے نورانیت پہنچتی تھی ان کی طرح تو ان کا کوئی صحابی بھی نہیں ہوسکتا اس لئے کہ آپ ﷺ کا براہ راست آسمان سے تعلق تھا وحی آتی تھی، صحابہ کرامؓ کا آسمان سے تعلق براہ راست نہ تھا لیکن اس شخصیت سے تعلق تھا جس کے پاس آسمان سے برابر احکام آتے تھے اور رہنمائی ہوتی تھی اس طرح سارے انسانوں میں سب سے

بڑے اور افضل صحابہ کرامؓ ہیں اور ان سے بہتر اور افضل سرور کائنات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو حضور ﷺ کے قول وفعل وتقریر کے ساتھ صحابہؓ کے قول وفعل اور تقریر کو بھی نمونہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے ایک ہی بات کو ماننا چنانچہ مسلمان کے لئے قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کسی مسئلہ کے سلسلہ میں حکم نہ ہونے پر یہ بات کہ کسی صحابی نے اس کے بارے میں یہ کہا یا یہ کیا یہی دین بن جاتا ہے جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے کہ آپ ﷺ نے ایسا کیا اور ایسا کہا یہ تو دین ہے ہی، اس کو تو ایک معمولی آدمی سمجھتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا وہ دین ہے، لیکن جاننے کی یہ بات بھی ہے کہ صحابہؓ نے بھی جو فرمایا وہ بھی دین ہے اس لئے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا اور حضور ﷺ سے انھوں نے استفادہ کیا تھا۔ اور صحابہ کا ایمان ویقین اس درجہ کو پہنچ چکا تھا کہ وہ غلط بات کہہ ہی نہیں سکتے تھے، جو کچھ دیکھا اسی کو مانتے بھی تھے، اس لئے حضور ﷺ سے تعلق پیدا ہو جانے کے بعد چاہے ایک لمحہ کا ہو ایمان کے ساتھ اگر کسی نے حضور ﷺ کو دیکھا یا حضور ﷺ سے سنا تو وہ صحابی ہو گیا، صحابی ہونے کے بعد اس کا درجہ وہی ہو گیا جو صحابہ کرامؓ کا درجہ ہے دین کے سلسلہ میں اس کی بات بھی دین بن جاتی ہے کیونکہ وہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہے اس لئے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست اخذ کیا ہے ــــ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوحٰى" کہ آپ اپنے دل سے اور اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دین دیا گیا وہ وحی کے ذریعہ آیا، وحی کا طریقہ کہ بعض وقت پوری پوری سورتیں اور آیتیں آتی تھیں اور بعض وقت دل میں بات

ڈال دی جاتی اور بعض وقت خواب میں دکھا دیا جاتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی ورسول تھے اور نبیوں کے خواب اللہ تعالی نے سچے رکھے تھے وہ غلط خواب نہیں دیکھ سکتے تھے جو دیکھتے تھے اس کی حیثیت آسمانی حکم وہدایت کی ہوتی تھی، اس طرح آپ ﷺ کو حق بات پہنچائی جاتی تھی، کلام کی صورت میں اس کی دو شکلیں تھیں ایک تو وہ جو قرآن میں داخل کر دی گئی، وہ وحی متلو ہے یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور وہ جو قرآن میں داخل نہیں کی گئی، وہ وحی غیر متلو ہے، وحی مختلف طریقے سے آتی تھی، اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری باتیں اوپر سے بتائی ہوئی اور دی ہوئی ہوتی تھیں، آپ ﷺ دین کے تعلق سے کوئی بات اپنے دل سے نہ کہتے تھے بلکہ وہ کہتے تھے جو وحی میں ان کو بتلائی جاتی ''اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحیٰ'' اسی لئے آپ ﷺ کا جو کچھ کہا ہوا ہے وہ خالص اللہ کا کہا ہوا ہے آپ ﷺ نے جو کچھ کہا وہ گویا اللہ نے کہا، اسی طرح صحابی نے جو کچھ کہا وہی کہا جو اللہ کے رسولؐ نے کہا، ان کو اللہ پر ایمان ویقین تھا دین کے سلسلہ میں کوئی بات دل سے نہ کہتے تھے۔ وہ جو بھی کہتے اللہ کے رسول ﷺ سے سن کر یا دیکھ کر کہتے تھے۔ مثلاً دیکھا کہ فلاں بات ہو رہی تھی جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے دیکھ کر روکا نہیں تو انھوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے غلط نہیں سمجھا اس لئے نہیں روکا تو وہ کہیں گے کہ فلاں چیز جائز ہے، تو صحابہ کرامؓ نے جو کچھ کہا اور کیا وہ اللہ کے رسول ﷺ نے کہا اور کیا، اور اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ کہا وہ گویا اللہ کی طرف سے ان کے دل میں بات ڈالی گئی یا ان کو پہنچائی گئی۔

اللہ کے رسول ﷺ کا طرز عمل اور طرز زندگی یہ دونوں دین ہے، اور صحابہ کرامؓ کا بھی طرز عمل اور طرز زندگی دین ہے، اور حدیث شریف اسی کا مجموعہ ہے۔

حدیث شریف ایسی چیز ہے کہ ہمارا پورا دین اسی سے ماخوذ ہے، اور اسی سے مختلف علوم نکلے ہیں، اسی سے فقہ نکلی ہے، فقہ کیا ہے؟ مسئلے مسائل عبادات اور

اوامر ہیں، نماز میں قیام کیسے ہونا چاہئے رکوع کیسا ہونا چاہئے کیا پڑھنا چاہئے اور کس طرح پڑھنے کی ضرورت ہے، فرض ہے، واجب ہے، سنت ہے، نماز روزہ، زکوہ، حج وغیرہ کے مسائل فقہ میں ملیں گے۔

اور وہ اعمال جن کا طرزِ عمل طریقہ کار فقہ نہیں بتلاتی وہ عام اخلاقی ہیں، عام عبادات ہیں، اور طور وطریق ہیں اور یہ سب بھی حدیث میں ملتے ہیں جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح وعظ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں بات کی مذمت فرمائی فلاں کام کو اچھا اور نیک کام بتایا، یہ سب باتیں عام اخلاق میں آتی ہیں۔

اس حدیث کو دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا مؤثر وعظ فرمایا کہ سب کی آنکھیں بہنے لگیں اور سب لرز اٹھے روایت میں آتا ہے کہ: "وجلت منها القلوب وذرفت منها العيون" وجل اس خوف کو کہتے ہیں جو دل میں لرزہ پیدا کردے، خوف کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، عربی میں اس کے مختلف الفاظ ہیں، خوف کا لفظ آتا ہے، حذر اور ذعر کا بھی لفظ آتا ہے، وجل اور خشیت کا بھی لفظ آتا ہے، ان سب میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے اور ان کے موقع استعمال بھی الگ الگ ہیں کہ کس کیفیت میں کون سا لفظ زیادہ بہتر ہے، عام خوف کو خوف کہتے ہیں، لیکن جب کسی چیز کو دیکھ کر اچانک خوف آجائے اس کو ذعر کہتے ہیں، خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو دل میں احترام کے جذبہ کے ساتھ ہو، وجل اس خوف کو کہتے ہیں کہ جس میں آدمی لرز جائے۔ تو صحابہ کرام کا ایمان اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جب آپ سے جنت کی یا جہنم کی بات سنتے تھے تو لرز جاتے تھے، ان کا ایمان اتنا قوی تھا کہ جنت کا ذکر ہوتا تھا تو گویا جنت ان کو نظر آرہی ہے، اور اگر دوزخ کا ذکر ہوتا تو گویا دوزخ نظر آرہی ہے، آگ لپکتی ہوئی نظر آرہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آگ ہماری طرف

بڑھ رہی ہے اور کہیں ہمیں چھو نہ لے یہ کیفیت صحابہ کرام کی ہوتی تھی اس کیفیت کے بعد کیا دل ان کا لرز نہیں جائے گا؟ آپ سو رہے ہوں اور آگ لگ گئی اور اچانک آپ نے دیکھا کہ وہ آپ کی طرف بڑھ رہی ہے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہوتو آپ کا دل لرز جائے گا معلوم ہوا کہ موت سامنے ہے، یہ کیفیت صحابہؓ کی ہوجاتی تھی اس لئے کہ ان کا ایمان اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جو چیزیں ہم پڑھتے ہیں اور اس کو علمی طور پر مان لیتے ہیں دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا، لیکن ان کو اس پر اتنا یقین ہوتا تھا کہ جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی وہ مؤثر تھی، سننے والے آپ ﷺ کے صحابی تھے ایسے ایمان والے تھے کہ سن کر بے حد متاثر ہوئے اور ڈر گئے کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور لوگوں نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ نے ایسا وعظ فرمایا جیسے کہ آپ آخری وعظ فرما رہے ہوں، اور اتمام حجت کرر ہے ہوں اور جس کے بعد کچھ کہنا نہیں کہ یہ آخری بات ہے جو کہہ رہے ہیں آپ ﷺ کچھ نصیحت کیجئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اوصیکم بتقوی اللّٰہ والسمع والطاعة وان تامر علیکم عبد" (میں تم کو نصیحت کرتا ہوں ہدایت دیتا ہوں کہ دل میں خدا کا ڈر پیدا کرو اور بات سنا کرو اور مانا کرو جس طرح وہ شخص کرتا ہے جو کسی بااختیار آقا کا غلام ہو، یہ ایسی حدیث ہے کہ خاص طور پر اس زمانہ کے لئے اس میں بہت ہی روشنی ہے، یہ زمانہ ایسا ہے کہ خودغرضی اور آپس میں تعلقات کی خرابی، اور ایک دوسرے سے کشمکش اور لڑائی، اور ایک دوسرے کی مخالفت مسلمانوں میں نہایت عام ہوگئی ہے۔ لیڈر لیڈر سے لڑ رہے ہیں، واعظ وعلماء تک آپس میں لڑ رہے ہیں، حضور ﷺ نے جو فرمایا ہے وہ اسی لئے فرمایا کہ آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے یہ بتلا دیا گیا تھا کہ اس امت پر ایسے دور آئیں گے، اور یہ بات اسی زمانہ میں نہیں بلکہ اس سے پہلے سے ہوتی رہی ہے،

تو حضور ﷺ کو اللہ کی طرف سے یہ بات بتلا دی گئی تھی کہ امت ان حالات سے گذرے گی اس لئے آپ ﷺ نے اس سے خبردار کیا کہ دیکھو ایسے حالات پیش آسکتے ہیں اس میں تم کو کیا کرنا چاہئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور جو شخص خدا سے ڈرے گا جس کو واقعی ڈرنا کہتے ہیں جیسا کہ صحابہ کرامؓ ڈرتے تھے، تو وہ اس طرح کی چیزوں میں نہیں پڑے گا، مثال کے طور پر آگ سے آپ ڈر رہے ہیں خدانخواستہ آگ لگ گئی آپ آگ کے سامنے کھڑے ہیں اس وقت وہاں آپ کا مخالف بھی پہنچ گیا ہے تو کیا ایسے موقع پر آپ اپنے مخالف سے دشمنی کریں گے؟ نہیں کریں گے بلکہ دونوں مل کر بچنے کی کوشش کریں گے، اور اس وقت دونوں متفق ہو جائیں گے، دونوں ایک دوسرے کا تعاون کریں گے کہ بھائی آگ لگ رہی ہے اس کو بجھانے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ہم اپنے اختلاف نہیں دیکھیں گے، اس وقت ہم دونوں مل جائیں گے، صحیح مومن اللہ کے غضب و ناراضی سے اسی طرح ڈرتا ہے اور اس کے عذاب سے ڈرتا ہے، اس کی پکڑ سے ڈرتا ہے اور اللہ سے اس طرح ڈرنے کا سبب یہ بنتا ہے کہ اللہ نے کہا کہ قیامت کے دن ہم تمہارا حساب لیں گے اور تمہارے اعمال کے مطابق جزا و سزا دیں گے اگر برے اعمال ہیں تو جہنم اور اگر اچھے اعمال ہیں تو جنت دیں گے، اس میں پورا پورا معاملہ ہوگا وہاں رعایت نہیں، ہاں اگر بعد میں اللہ رحم فرمادے تو اس کا فضل ہے کوئی اسے روک نہیں سکتا، تو جب ہم کو اس پر واقعتاً یقین ہوگا اور خدا سے واقعتاً ڈر ہوگا تو ہمیں بے حد فکر اس کی ہوگی کہ اللہ ہم سے ناراض نہ ہو، جب اللہ کی رضا مندی یا ناراضگی کی فکر ہوگی تو یہ سب چیزیں چھوٹ جائیں گی کہ فلاں نے ایسا کر دیا فلاں نے ایسا کہا، مومن سوچتا ہے کہ فلاں نے ایسا ویسا اگر کر دیا تو کتنا نقصان کیا، اس سے زیادہ نقصان تو اس میں ہے کہ آدمی

اپنے عمل کے نتیجے میں جہنم میں پہنچ جائے ہماری دنیا کتنی ہے اور کیا اہمیت رکھتی ہے وہ اگر برباد ہو جائے تو کتنا نقصان ہے، اللہ سے ڈرنے والا یہ دیکھتا ہے ہماری دنیا برباد ہو جائے لیکن ہماری آخرت سنور جائے جہاں ابدالآباد کی زندگی گذارنی ہے، صحابہ کرامؓ کے دل کی کیفیت یہی بن گئی تھی جب ان کو جہنم سے ڈرایا جاتا تھا تو وہ واقعی ڈرتے تھے اور خوف زدہ ہو جاتے تھے اور آنسو جاری ہو جاتے تھے اور ان باتوں میں پڑنے یا کرنے سے دور بھاگتے تھے جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے، قرآن مجید میں تلقین آئی ہے کہ اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے فرمایا: "اتقوا اللہ حق تقتہ" اور ایسا ڈر واقعی پیدا ہوتا ہے تو بس آپس کے اختلافات، لڑائیاں، شکایات اور یہ کہ ان کو زیادہ اور ہم کو کم دیا گیا، ہمارے ساتھ ظلم کیا گیا، خود غرضی کی گئی، یہ سب ماند اور کمزور پڑ جاتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تقوی اختیار کرنے کی ہدایت کے بعد فرمایا کہ امیر کی بات سنو اور مانو اور جب مومن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو خوب مانتا ہوگا تو یہ حکم بھی مانے گا اور سب لوگ امیر کی باتیں ماننے لگیں تو جھگڑا ختم ہو جائے گا اور غلط کام بھی ختم ہو جائے گا، فرمایا "انہ من یعش منکم فسیریٰ اختلافا کثیرا" کہ بعد میں جو زندہ رہیں گے جب کہ ایمان کی کمزوری آجانے پر اختلافات اثر انداز ہونے لگیں گے تو وہ لوگ بڑا اختلاف دیکھیں گے، ایک دوسرے سے مخالفت اور نفرت رکھنے والے لوگ ہونے لگیں گے ایسے وقت میں میں تم کو وصیت کرتا ہوں "علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین" کہ میرا طریقہ اور خلفائے راشدین کا طریقہ اختیار کرو اور اس پر نظر رکھو کہ میں نے کیا کیا اور ایسے موقع پر صحابہؓ نے کیا کیا۔ خاص طور پر خلفاء راشدین کو دیکھو۔

سنت کے معنی طریقہ عمل کے ہیں اور "السنۃ" سے مراد سنت رسول ﷺ

ہے اور سنت کی اضافت جس کی طرف کی جائے اس کی سنت اور اس کا طریقہ ہو جاتا ہے، تو آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ میری سنت پر عمل اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرو یعنی میرے طریقہ کو دیکھو اور اس کو اختیار کرو اور صحابہؓ کے طریقہ کو دیکھو اور اس کو اختیار کرو، اگر میرے طریقہ پر عمل کرو گے اور خلفائے راشدین کے طریقہ کو سامنے رکھو گے تو آپسی اختلافات اور کشمکش مصیبت اور آفت سے بچ جاؤ گے اور فرمایا کہ "عضوا علیھا بالنواجذ" (اس کو دانتوں سے پکڑو) یہ عربی کا محاورہ ہے اردو میں کہتے ہیں اس کو دانتوں سے پکڑنا (یعنی کس کے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لینا) عض کے معنی دانت سے انسان کے گوشت کو دبا لینا جیسے دانت سے کاٹنے والا جانور دانت سے ہاتھ یا جسم کا کوئی حصہ دبا لیتا ہے اسی سے ایک دوسرا محاورہ عربی میں انگلیوں کو دانت سے دبانے کا ہے اسی سے "عضو الانامل" آتا ہے یہ بھی محاورہ ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب آدمی کسی بات پر رنج وافسوس میں ہو اور دانت سے انگلیوں کو دبا رہا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر کے محاورہ میں یہ فرمانا تھا کہ میری سنت اور صحابہ کی سنت کو مضبوطی سے پکڑ لو، اگر ایسا کرو گے تو خطرہ سے بچ جاؤ گے۔

"وایاکم ومحدثات الامور" دین کے معاملہ میں نئی نئی باتیں ایجاد ہوں تو ان سے بچو "وایاکم ومحدثات الامور" اپنے کو بچاؤ اور بچو یعنی لوگ اپنے فائدوں کی غرض سے محض اندازوں سے دین کے اندر نئی باتیں کرتے رہتے ہیں ان سے بچو اور یہ دین کے معاملہ میں ہے دنیا کے معاملہ میں نہیں دنیا کے معاملہ میں آدمی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق کام کرے لیکن دین کے معاملہ میں جہاں اسے اللہ کی رضا کا معاملہ ہوتا ہے اس میں اگر کوئی نئی بات ایجاد کی جاتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نہیں بتائی تو وہ "مُحدَثٌ" ہے، یعنی نئی کردی گئی ہے، نئے نئے اختیار کردہ معاملات سے بچو جن کو لوگ دین بناتے

ہیں حالانکہ وہ دین نہیں ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بتایا اور کہا یا کیا ہے یا صحابہ کرامؓ نے کہا اور کیا ہے اس کے علاوہ جو نئی چیز اختیار کی جائے گی وہ دین نہیں بلکہ بدعت ہے، بدعت کا مطلب دین میں نئی بات ایجاد کرنا ہے اور دین کے اندر نئی بات کا ایجاد کرنا کسی کا حق نہیں کیونکہ دین مکمل کر دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" (میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا) دین مکمل ہو گیا اب کوئی نئی بات دین میں داخل نہیں ہوگی "و کل بدعة ضلالة" (حدیث) اور فرمایا ہر نئی بات اور نئی ایجاد یعنی جو بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں سے الگ ہوگی گمراہی ہوگی، ہدایت وہ ہے جو اللہ و رسول ﷺ سے ہم کو ملی، گمراہی وہ ہے جو دین میں نئی بات اختیار کی گئی جس کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے یہاں کوئی سند نہیں اور رہنمائی نہیں ملتی وہ بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہے۔

(مذکورہ بالا مضمون وہ تقریر ہے جو معہد سیدنا ابوبکر صدیق مہپت مئو لکھنؤ میں ختم ریاض الصالحین کے موقع پر کی گئی)

سیرت واخلاق کی تعمیر میں حدیث کا کردار

قرآن مجید کی آیت ہے " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" کہ اللہ کے یہاں دین تو اسلام ہے" یعنی زندگی کا وہی طور طریق قابلِ قبول ہے جو اسلام میں بتایا گیا ہے، ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے کہ " وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْناً فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ " کہ جو شخص اسلام کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ دوسرے طریقوں کو اختیار کرے گا، تو وہ عنداللہ قبول نہیں کیا جائے۔ اور اسلام کا بتایا ہوا طور وطریق وہ طور وطریق جو ہم کو قرآن مجید سے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے برتے ہوئے اور بتائے ہوئے احکام اور عمل سے پہنچا ہے اور وہ اللہ کو خدائے واحد مان کر اس کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق طریقۂ زندگی اختیار کرنا، دوسرے معنوں میں اپنے کو خدائے واحد کے حکموں اور مرضیات کے حوالہ کردینا ہے، اور یہی اسلام کے لفظی معنی ہیں اور مسلمان سے یہی مطلوب بھی ہے، کہ وہ خود کو اپنے پروردگار کے حوالہ کردے، یعنی اپنی مرضی کو اس کی مرضی کا تابع کردے۔

یہ بات اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں نہیں ہے، اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں مذہب کا مطلب ایک یا کئی خداؤں کو مانتے ہوئے صرف ایک متعین طریقہ سے ان کی عبادت کرلینا ہے، ان کے یہاں مذہب زندگی کے دوسرے

پہلوؤں کے لئے کوئی متعین احکام نہیں رکھتا ہے۔لیکن اسلام میں ایک محدود عقیدہ اور کچھ متعینہ شکلوں کی عبادت ہی نہیں بلکہ عقیدہ وعبادت کے ساتھ ساتھ معاملات ومعاشرت اور اخلاق کے لئے خصوصی ہدایات اور رہنمائیاں ہیں،اس میں عدل وانصاف،اخلاق کی درستگی اور نیکی،دوسروں کے ساتھ حسن سلوک،ظلم وزیادتی سے گریز، بے حیائی اور گندی باتوں سے پرہیز،شرافت وانسانی خوبیوں کو اختیار کرنا ہے۔یہ تمام باتیں اسلام میں دین کے اندر ہی داخل ہیں،چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں آتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو صرف اللہ کی عبادت کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو،کہیں آتا ہے کہ ناپ تول میں بے ایمانی نہ کرو،اور کہیں آتا ہے نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو،اسی طرح اسلام نے دین کو پوری انسانی زندگی پر پھیلا دیا ہے اور زندگی کو اس کا پابند بنایا ہے،جس کا بیان قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر آیا ہے۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام یعنی حدیث شریف میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اسی طرح اسلام نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو دین کے احاطہ میں کردیا ہے،چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ "المسلم من سلم المسلمون من لسانه و يده والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه" کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی زیادتی سے تمام مسلمان محفوظ رہیں،اور ہجرت کرنے والا دراصل وہ ہے جو ان تمام باتوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے،اسی طرح اسلام کے ماننے والے کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کیا حکم اور کیا طریقِ کار ضروری اور مفید ہے،اس کی تفصیل ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور احکامات میں ملتی ہیں،اور یہ احکامات آپ کی احادیث میں پھیلے ہوئے ہیں،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی زندگی

تئیس سال ہوئی، تیرہ سال مکہ مکرمہ میں جو آپ نے دین کی دعوت وتبلیغ میں صرف کی اور اس کے سلسلہ میں لوگوں کی بے اعتنائی، ایذا رسانی اور دھمکیوں کو برداشت کرنے میں گذاری، آپ نے یہ سب برداشت کیا، کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ قرآن کے حکم کے مطابق عمل کرتے رہے، جو اس مرحلہ کے لئے دیا گیا تھا، کہ نماز (یعنی عبادات الٰہی) کو ادا کرو اور اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو، یعنی کسی کی شرارت اور ایذا رسانی کا جواب نہ دو، انتقام نہ لو، حتی کہ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آئے، پھر دس سال مدینہ منورہ میں لوگوں کو دینِ اسلام کی طرف متوجہ کرنے اور دینِ اسلام کی تفصیلات بتانے اور ان پر عمل کروانے میں گزرے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر کفار کی زیادتیوں کا جواب دینے کی اجازت ملی، اور کفار نے جب مسلمانوں پر حملے کئے اور جنگیں کیں تب آپ ﷺ نے اپنے رفقاء کے ساتھ ان حملوں اور جنگوں کا مقابلہ کیا، اور بہادری اور غیرت دینی اور اسلام کو سر بلند رکھنے والے جذبہ سے کام لیا، اور ان جنگوں میں بھی اعلیٰ انسانی اقدار کا لحاظ رکھا، یہ سب آپ ﷺ کے رفقاء اور ساتھ دینے والوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سنا اور ان سب پر عمل کیا، اور اپنے بعد والوں کو سنایا، بتایا، پھر ان کے سننے اور دیکھنے والوں نے اپنے بعد کے لوگوں کو بتایا اور سنایا، اور یہ سب حدیث شریف کے ذخیروں میں محفوظ ہوگیا، حدیث کے معنی گفتگو اور باتوں کے ہیں، حدیث رسول کا مطلب رسول کی باتیں اور گفتگو کے ہوئے، اور یہ سب گفتگو اور باتیں دین اسلام کی باتیں ہوئیں۔

رسول کی باتیں ارشادات اور ہدایات میں وہ ذخیرہ ہے جن سے دینِ اسلام اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ سامنے آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے، اس طرح حدیث شریف اللہ تعالیٰ کے کلام ''قرآن مجید'' کے ساتھ اسلام کی تمام باتوں کا

ذخیرہ اور خزانہ ہے، اسی لئے مسلمانوں کو اپنی زندگی کو دینِ اسلام کے مطابق کرنے کے لئے حدیث کو سننا، پڑھنا اور معلوم کرنا ہوتا ہے، قرآن مجید اور حدیث شریف اصلاً عربی زبان میں ہے، حدیث شریف میں ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات اور رہنمائی کا ہے جن کا تعلق زیادہ تر مذہب کے عبادتی اور معاملاتی پہلو سے ہے، اور یہ زیادہ تر فقہ کے نام سے اور مسائل عبادات واحکام الٰہی کے جاننے کے لئے باقاعدہ پڑھا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں دوسرا حصہ اخلاق وسیرت سازی سے تعلق رکھتا ہے، اور ان کا اخلاق کی درستگی اور سیرت سازی میں اور انسان کی زندگی اور طور وطریق کو بہتر بنانے اور ترقی دینے میں بڑا کردار ہے، حدیث کے مسائل عبادت واحکام فقہ تو کوئی بھی عالم دین حسب ضرورت وطلب بتا سکتا ہے اور مدرسہ میں پڑھ سکتا ہے اور یہ سلسلہ الحمد للہ دور اول کے بعد ہی سے قائم چلا آرہا ہے، لیکن دوسرا پہلو جو اخلاق کی درستگی اور سیرت سازی کا ہے، اس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث طیبہ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کیونکہ اصلاح باطن اور تقویٰ اور خوف خدا خوف آخرت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے حدیث شریف میں بڑا ذریعہ اور اس کے مضامین اس کا بڑا ذخیرہ ہیں۔

تربیت وسلوک میں رعایت اور گفتگو میں ادبی حسن

رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم المرسلین تھے، انسانوں کی ہدایت اور راہ حق کی نشاندہی اور وضاحت کے لئے رب العالمین کی طرف سے بھیجے گئے تھے، ان کی زندگی کا کام دپیغام دین حق کا پہنچانا اور شریعت اسلامی کی وضاحت تھی، لیکن وہ رسول ہونے کے ساتھ ساتھ انسان تھے، انسانی احساسات، تأثرات، معاملات سے ان کو بھی اسی طرح واسطہ پڑتا تھا، جس طرح کسی انسان کو پڑتا ہے، دعوت دین کی راہ میں ان کو صعوبتیں پیش آتی تھیں، وہ ان صعوبتوں کو انسان ہونے کے ناطے محسوس کرتے تھے، اہل تعلق سے محبت، حوادث پر رنج، خوشی کے موقع پر مسرت آپ کو بھی انسانوں کی طرح ہوتی تھی، جہاں ان احساسات وتأثرات کے اظہار کا آپ ﷺ موقع محسوس کرتے، ان کا اظہار فرماتے تھے، اسی طرح آپ ﷺ نے اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؓ کی وفات پر اپنے تأثرورنج کا اظہار فرمایا، جس میں ایک طرف آپ ﷺ کی عبدیت اور احتیاط کا پورا اظہار ہے، دوسری طرف انسانی تأثر کے سچے اظہار کے لئے بہت فصیح اور مؤثر طرز ادا ہے، فرمایا:

”القلب يحزن ، والعين تدمع، ولا نقول إلا ما يرضى الربّ، وأنا على فراقك يا إبراهيم ! لمحزون“

”دل رنجیدہ ہے آنکھ میں آنسو آرہے ہیں، لیکن ہم وہی کہتے ہیں جس سے رب راضی ہو، ہم تمہاری جدائی سے اے ابراہیم رنجیدہ ہیں“

ذرا حقیقت کی عکاسی دیکھئے اور طرز ادا کی احتیاط دیکھئے، کیا یہ ادب نہیں؟

آپ ﷺ نے ایک موقع پر خواتین کی نزاکت کی کیفیت کا لحاظ اپنی عبارت میں اس طرح فرمایا کہ کہا :” رفقاً بالقواریر“ اس میں آپ ﷺ نے خواتین کو آبگینوں سے تشبیہ دی، ایک موقع پر آپسی اختلاف کی گنجائش نہ بتاتے ہوئے فرمایا: ”لا ینتطح فیه عنزان “یعنی اس معاملہ میں دو بکریاں آپس میں سینگ نہ لڑائیں گی، ذرا بکریوں کے یہ انداز سامنے رکھئے کہ دو بکریاں جب اکٹھا ہو جاتی ہیں، اپنے اگلے پیروں کو اٹھا کر سینگ لڑاتی ہیں، آپ ﷺ نے اس انداز کو دو شخصوں کی آپسی کشمکش کے اظہار کے لئے انتخاب کیا، اسی طرح آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ” هذا یوم له ما بعده “ یعنی آج کا دن ایسا ہے کہ اس کا سلسلہ بعد میں چلے گا، ذرا اس طرز ادا کو دیکھئے، کتنے اچھے طریقہ سے کسی قضیہ کے کسی نہ کسی شکل میں جاری رہنے کا امکان بتایا گیا ہے۔

یہ تو جملے تھے، آپ ﷺ کے اس خطبہ کو دیکھئے جو آپ ﷺ نے ہوازن سے واپسی پر مال غنیمت کی تقسیم میں بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے دیا، اور آپ کی مختلف دعاؤں کو دیکھئے، کیسی باریکی اور نفسیاتی کیفیت کا لحاظ اور تأثرات کی سچی ادائیگی ملتی ہے، اس میں اپنی عبدیت اور پروردگار کی عظمت کا پورا احساس اُجاگر ہے۔

مؤثر اور فصیح طرز ادا اور دل کو متحرک کر دینے والی تعبیر، دعوت دین کے کام کے لئے ایک ضروری اور مؤثر ذریعہ تھا، امت کی رہنمائی اور تعلیم وتزکیہ کے لئے بھی اس کی ضرورت تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی صلاحیت آپ کو بدرجہ اتم عطا فرمائی گئی تھی، بہر حال آپ ﷺ کی فصاحت اور حسن ادا جو آپ ﷺ کی گفتگو،

خطابت، نصیحت اور اپنے رب کے سامنے اظہار عاجزی، حمد و مناجات میں کھلے طریقہ سے ظاہر ہوتی ہے، آپ ﷺ کی فصاحت کلام و حسن بیان پر سب کو اتفاق ہے، عربوں میں صحت کلام و فصاحت کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی تھی، وہ بھی آپ ﷺ کو بدرجۂ اتم حاصل تھے، آپ ﷺ فصیح ترین قبیلہ قریش میں پیدا ہوئے، پھر قبیلہ بنی سعد میں رضاعت کا زمانہ گزارا یہ قبیلہ فصیح قبائل میں شمار کیا گیا ہے، پھر پاکیزہ زندگی اور پاکیزہ خیالات واحساسات آپ ﷺ کا طرز رہا، پھر نبوت ملی تو بلاغت واعجاز بیان کا معیاری کلام قرآن مجید آپ ﷺ پر اتارا جانے لگا، وہ آپ ﷺ کا اصل معلم و مربی تھا، آپ ﷺ کا قلب و ذہن اور آپ ﷺ کا اسلوب بیان سب نے اس آسمانی معلم سے کسب فیض کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جہاں ایک طرف مناجاتیں اور دعائیں ہیں، وہاں دوسری طرف قابل قدر اشخاص اور محبین کے ساتھ محبت و تعلق کے بلیغ جملے ہیں اور اغیار سے گفتگو میں جو کلام فرمایا ہے، اس میں موقع و محل کی نزاکت کا موثر لحاظ ہے، آپ ﷺ نے بنی عبد قیس سے جو آپ ﷺ کے قبیلہ قریش کی نظر میں اغیار تھے، ملاقات کے لئے آنے پر زیادہ دلداری اور ملاطفت کا اظہار موثر و دلنواز اسلوب میں بیان فرمایا: "مرحبا بالقوم غیر خزایا ولا ندامی" آپ ﷺ لوگوں کو بہت بہت خوش آمدید آپ ﷺ کو کوئی بے احترامی کا معاملہ نہیں ملے گا، اور نہ آپ ﷺ کو آنے پر افسوس ہوگا" اس سب کے علاوہ آپ کی زبان مبارک سے متعدد موقعوں پر ایسے جملے نکلے جو کہاوت اور مثل بن گئے اور آج تک ضرب الامثال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

پھر آپ کی گفتگو اور خطاب کو دیکھئے تو وہاں ادبی حسن و تاثیر کی پوری چھاپ ملتی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے، آپ ﷺ کا حضرات انصار سے موثر خطاب، آپ ﷺ کا حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب، آپ ﷺ کی وہ دلنشیں تشریح جو آپ ﷺ نے یہ مثال

دے کر کہ ''برا کام کرنے والوں کو اگر ان کے رفقاء نے ان کے برے کام سے نہ روکا تو ان کی ایسی مثال ہوگی کہ کسی دو منزلہ کشتی پر اوپر بیٹھے لوگ نچلی منزل میں بیٹھے لوگوں کو اگر دیکھیں کہ وہ دریا سے پانی لینے کے لئے اپنی منزل کے پیندے میں سوراخ کر رہے ہیں اور وہ دوسروں کی مصیبت سمجھ کر ان سوراخ کرنے والوں کو نہ روکیں گے تو دونوں منزل کے سوار تباہ ہو جائیں گے'' اسی طرح آپ ﷺ نے اس کی رہنمائی کی وضاحت کرتے ہوئے جو آپ ﷺ تمام لوگوں کے لئے لائے پھر کچھ لوگوں نے مانا، اور کچھ لوگوں نے نہ مانا، آسان اور دلنشیں اسلوب میں مثال دیتے ہوئے کہا: ''کہ بارش کا پانی زمین پر بہتا ہے مقامی زمین کو سیراب کرتے ہوئے دور کے لوگوں کو بھی بہہ کر پہنچتا ہے۔ اس طرح دونوں زمینوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، لیکن کچھ زمین سپاٹ پتھر کی طرح ہوتی ہے، پانی سے فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ ادھر ادھر بہا کر ضائع کر دیتی ہے'' آپ ﷺ نے اس مثال سے زمینوں کے حقیقی فائدہ اٹھانے والے اور اس علم کو ضائع کر دینے یا نا قابل قبول سمجھنے والوں سے بڑے سہل اور بلیغ انداز میں تشبیہ دی آپ ﷺ نے اپنی زوجہ مطہرہ کی دلداری کے لئے ان کو دلچسپ اور ادبی زبان میں ایک تبصرہ سنایا جس میں متعدد بیویوں نے اپنے اپنے شوہروں کے بارے میں اظہار رائے کیا تھا وہ تبصرہ حدیث ام زرع کے نام سے حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔

مسلمانوں کی بڑی خصوصیت اور اہم صفت قرآن مجید میں یہ بتائی گئی ہے کہ:

''كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ'' (سورہ آل عمران: ۱۱۰)

کہ تم وہ بہترین قوم ہو جو تمام انسانوں کے لئے نکالی گئی ہو، تم اچھی بات کی طرف متوجہ کرتے ہو اور بری بات سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

مسلمانوں کی یہ صفت وخصوصیت قرآن مجید میں صرف بتائی ہی نہیں گئی ہے بلکہ اس کا باقاعدہ حکم دیا گیا ہے کہ تم میں ایک تعداد ایسی ہونی چاہئے کہ جو اچھی باتوں کی طرف دعوت دیتی ہو اور نیکی کی تلقین کرتی ہو اور اچھی بات کی ہدایت کرتی ہو اور بری بات سے منع کرتی ہو:

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (سورہ آل عمران:)

اور یہ فرمایا گیا کہ یہی لوگ کامیاب ہیں۔

"وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"

یہ خصوصیت اور صفت مسلمانوں کی کامیابی کا ذریعہ بتائی گئی ہے اور مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی کامیابی کا راز اسی صفت میں رکھا گیا ہے۔ اس پر عمل کرنے کی بنا پر وہ دنیا میں ہر جگہ پھیلے ہیں۔

ہم کو اپنے حالات اور واقعات کے سلسلہ میں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہئے، قرآن مجید میں آتا ہے:

"وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ" کہ تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کا ہی حاصل کیا ہوا نتیجہ ہوتا ہے، یعنی اپنے پروردگار کے حکموں سے روگردانی اور برے اعمال اختیار کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بہت کچھ معاف بھی کر دیتا ہے، یعنی تمہارے بہت سے گناہوں کی گرفت نہیں کرتا بلکہ معاف کر دیتا ہے، ذرا ہم اپنے گریباں میں منھ ڈال کر دیکھیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے خلاف کتنی حرکتوں اور بری عادتوں میں مبتلا ہیں، ہم کو غور کرنا چاہئے اور اللہ کے غضب کو بلانے والی چیزوں سے بچنا چاہئے، ظالم کا مقابلہ اسی جگہ پر ہے اس کو ضرور سزا ملنی چاہئے اور وہ انشاء اللہ

ملے گی، لیکن ہم دینی واخلاقی لحاظ سے اپنے کو دیکھیں کہ ہم نے اللہ کے غضب لانے والے کام تو نہیں کیئے اگر کیئے ہیں تو ان کی اصلاح کریں اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اس طرح اس کی ناراضی سے بچ سکیں گے اور اس کی رحمت و مدد کے مستحق بن سکیں گے اور جب اس کی مدد ہوگی تو کوئی بھی ہم کو کچھ بھی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔

سیرت نبوی ﷺ اور ادب

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"خلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَان"

"کہ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو قوت بیان یعنی اچھا پیرایۂ کلام سکھایا"

اور قرآن مجید کی خوبی بتاتے ہوئے فرمایا کہ:

" وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝

"اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ (جبرئیل) لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں ،تا کہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں"

اور اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء کرام کے متعلق فرماتا ہے کہ:

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ

"کہ ہم نے جب کوئی رسول بھیجا تو اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ اچھے پیرایہ میں ان کے سامنے بات رکھ سکے"

اور خود قرآن مجید میں صاف و دلنشیں اور اثر انگیز پیرایہ میں بات کہی گئی ہے۔
انسانی زندگی بہت متنوع ہے اور وہ احساسات وجذبات کی آماجگاہ ہے، اسلام دین فطرت ہونے اور انسان کی فطری ضرورت کا لحاظ رکھنے کی وجہ سے زندگی کے تمام پہلوؤں کی رعایت رکھتا ہے۔ ادب کا کام زندگی کی ترجمانی ہے۔ ادب الفاظ کے ذریعہ زندگی کے احساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا ہم جب ادب کے ساتھ اسلامی کا لفظ وابستہ کرتے ہیں تو یہ بتانے کے لئے وابستہ کرتے ہیں کہ اسلام کے جائز کئے ہوئے وسیع دائرہ زندگی میں کسی بھی امر کے لئے جو الفاظ موثر و کامیاب ترجمانی کرسکیں، ان کے ساتھ جو ادب ہو وہ اسلام کا ہوتا ہے، اس طرح ادب اسلامی محض دعوتی دائرہ میں یا محض وعظ و نصیحت کے اندر محدود نہیں اس کا دائرہ صحت مند اور اسلام کی طرف سے جائز کردہ زندگی کے تمام احساسات کی ترجمانی کا ہے۔ شاعری میں مدح سرائی ہو، غزل ہو یا مرثیہ گوئی ہو، اور نثر میں افسانہ ہو، ناول ہو یا کوئی انشائیہ ہو خطبہ ہو یا خطوط ہوں وہ سب ادب ہونے کے ساتھ اسلامی دائرہ کے اندر سمانے کے لائق ہونے پر صفت اسلامی سے متصف ہونے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس کے نمونے مسلمانوں کی تحریروں اور تقریروں کی طویل تاریخ میں بہت ملتے ہیں، اور ان سے مسلمانوں کی زندگی پر اچھے اثرات بھی پڑے ہیں، اور ان سے نوخیز ذہنوں اور مزاجوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اسلام میں ادب کی سرپرستی اور ہمت افزائی اہل علم واہل ذوق نے تو کی ہی ہے، بہت سے قائدین نے بھی کی ہے۔ قرن اول میں بھی ادب سے دلچسپی کی مثالیں خاصی ملتی ہیں اولاً تو اس کی سرپرستی قرآن وحدیث سے ہوئی ہے۔ جس کی مثالیں ہم کو اچھی خاصی ملتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جہاں ایک طرف مناجاتیں اور دعائیں ہیں وہاں دوسری طرف قابل قدر اشخاص اور محبین کے ساتھ محبت و تعلق کے بلیغ جملے ہیں اور اغیار سے گفتگو میں جو کلام آپ ﷺ نے

فرمایا ہے اس میں موقع ومحل کی نزاکت کا موثر لحاظ ہے۔

اور آپ ﷺ کی زبان مبارک سے متعدد موقعوں پر ایسے جملے نکلے جو کہاوت اور مثل بن گئے اور آج تک ضرب الامثال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ کی گفتگو اور خطاب کو دیکھئے تو وہاں ادبی حسن وتاثیر کی بڑی چھاپ ملتی ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے ایک موقع پر اپنی سواری پر شریک سوار سے جاہلیت کے دور کے ایک شاعر کا کلام کہہ کہہ کر سنا، کلام اچھا اور دین کی حمایت میں تھا، آپ ﷺ نے سن کر فرمایا کہ ان اشعار کے شاعر کی زبان نے اسلامی مزاج کے مطابق کام کیا لیکن اس کا دل کافر ہی رہا، الفاظ تھے آمن لسانه و کفر قلبه آپ ﷺ نے کعب بن زہیر سے اپنی مدح میں قصیدۂ مدحیہ سنا اور باوجود اس کے کہ اس کے قصیدہ میں جاہلی دور کا پورا انداز تھا لیکن وہ نیا نیا مسلمان ہو رہا تھا اس کو اسلام کا تقاضہ اور طرز معلوم نہ ہوسکا تھا لہٰذا آپ ﷺ نے صرف سنا ہی نہیں بلکہ اس پر انعام بھی دیا۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرامؓ کے شعر کہنے کو نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ مسلمان ہوجانے والے شاعروں کو اپنی شاعری دین کی حمایت میں استعمال کرنے کا حکم دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے خود شاعری نہیں کی لیکن نثر میں بڑی بلاغت اور ادبیت ظاہر فرمائی۔ آپ ﷺ نے انسانی سرشت بتاتے ہوئے ایک بار ایک واقعہ قصہ کی شکل میں اور سہل انداز میں بیان کیا۔ اس قصہ میں ایک نابینا، ایک گنجے اور ایک کوڑھی کے طرز عمل کا تذکرہ فرمایا اور اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے انسانی فطرت واحساسات اور نفسیاتی حال کی عکاسی آپ ﷺ کے کلام بلاغت نظام میں بکثرت ملتی ہیں جو ہم کو متوجہ کرتی ہیں کہ ادب اسلام سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ لیکن وہ اسلام کے سایہ میں صحت مندانہ انداز سے چلتا اور کام کرتا

ہے۔اور ہماری مراد اسلامی ادب سے وہی ادب ہے جو زندگی کی رہنمائی انسان کی صحت مندانہ مصلحتوں اور تقاضوں کے مطابق کرتا ہو، اور باوجود تنوع اور وسعت کے صحت مندانہ دائرہ سے باہر نہ چلا جائے۔ایسا ادب نہ صرف مسلمانوں کی ضرورت ہے بلکہ تمام انسانوں کی ضرورت ہے۔وہ انسانی قدروں کا محافظ اور انسانوں کی خوشی و رنج میں شریک مسرت و غمگسار الم بھی ہے، اس کی سرشت اسلامی ہے، مذاق انس و ہمدردی ہے، دائرہ کار میں زندگی اور پوری انسانیت ہے اور عہد نبوت سے شروع ہو کر آئندہ مستقبل کے اندر دور تک پھلا ہوا ہے۔

ہم کسی بھی ادبی نمونہ کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے تعین کے لئے اس کو ان وسعتوں اور احتیاطوں کے دائرے میں رکھتے ہوئے دیکھنا ہوگا جو ہم کو اسلام کی طرف سے واضح رہنمائیوں میں بتائی گئی ہیں۔وہ ادبی نمونہ جس قدر ان سے مطابقت رکھتا ہوگا اسی قدر اس کو اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح سمجھا جائے گا۔اور جس قدر ان سے گریزاں ہوگا اسی قدر اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے دور سمجھا جائے گا۔

مکہ کے ایک شاعر جو مذاہب کی تعلیمات سے واقفیت کے اثر سے جنت، دوزخ، آخرت، خدا، اس کی رضا جیسے خیالات سے واقف ہو گئے تھے اور اپنی شاعری میں ان کا تذکرہ کرتے تھے لیکن اس سے ان کو ایسی ضد ہوئی کہ اس کی بری طرح مخالفت کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے ایک رفیق سفر سے ان کے اشعار سنانے کی فرمائش کی اور بار بار فرمائش کر کے سنتے رہے۔پھر فرمایا کہ" آمن لسانه و کفر قلبه "(ان کی زبان نے تو ایمان والی بات کہی لیکن ان کا دل ایمان نہ اختیار کر سکا)

اسی طرح ایک شاعر مسلمان ہوئے اور انھوں نے ایک نظم کہی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اور شاعرانہ مضمون کے ساتھ بڑائی کا بھی تذکرہ کیا۔یہ

نظم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی۔ آپ ﷺ نے اس کو خوش اخلاقی کے ساتھ سنا، اس نظم میں ایک شعر ایسا آیا جس میں تعلّی کا انداز حدود بشریت سے آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا شعر یہ تھا کہ:

بلغنا السماء مجدنا وجدودنا

وانا لنرجو فوق ذلك مظهرا

''کہ ہماری عزت وعظمت آسمان تک پہنچ چکی ہے۔ اور اب ہم امید کرتے ہیں کہ اس سے بھی آگے جائے گی۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کو خدا تعالیٰ کے مقام سے گستاخی کا شبہ کرتے ہوئے ٹوکا، لیکن آپ ﷺ نے اچھے انداز میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہاں تک پہنچنے کا قصد ہے اے ابو لیلیٰ (ابو لیلیٰ شاعر کی کنیت تھی) انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ جنت تک۔ آپ ﷺ اس جواب سے مطمئن ہو گئے کہ ان کے کلام میں شان خداوندی سے برابری دکھانے کی شوخی نہیں ہے۔ آپ ﷺ کا ان کے اشعار خوش اخلاقی سے سننا پھر ایک شعر میں جو ایک شک پیدا کرنے والا مضمون محسوس ہوا، اس پر ٹوکنا ایک رہنمائی کا ذریعہ بن گیا، کہ شاعر کو فخر کرتے ہوئے کن حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

اسلام نے مسلمانوں کا جو ذہن بنایا تھا اور ان کے خیالات، امنگوں اور حوصلوں کو اس کے دائرے کا پابند کیا وہ ذیل کے ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ تھا کہ جاہلیت کے اصولوں میں یہ بات تھی کہ آدمی اگر اپنے خاندان کا یا اپنی پارٹی کا ہے تو وہ اچھا ہے۔ آنکھ بند کر کے تائید و مدد کا حقدار ہے اور قابل محبت و تعلق ہے۔ لیکن اگر وہ مخالف خاندان یا کیمپ کا ہے تو خواہ حق پر ہو روا داری کا مستحق نہیں۔ چنانچہ یہ فقرہ محاورہ بن کر رائج ہو گیا تھا کہ اپنے آدمی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم، اسی کے مطابق

جاہلیت کا شاعر کچھ لوگوں کی تعریف میں کہتا ہے کہ:

لایسالون اخاھم حین یندبھم

فی النائبات علی ماقال برھانا

''کہ یہ لوگ جب حوادث جنگ پیش آتے ہیں تو اپنے بھائی سے یہ نہیں پوچھتے کہ تم جنگ میں شرکت کے لئے بلا رہے ہو تو کس بات پر جنگ ہے، یعنی آنکھ بند کر کے مدد کرتے ہیں۔''

وما انا الا من غزیة ان

غوت غویت وان ترشد غزیة ارشد

''کہ میں تو قبیلہ غزیہ سے ہوں وہ خراب کام کریں گے تو میں بھی خراب کام کروں گا، وہ اچھا کام کریں گے تو میں بھی اچھا کام کروں گا۔''

بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت وانصاف پسندی کی تعلیم دیتے ہوئے اس ذہنیت سے منع فرمایا۔ اس طرح مسلمانوں کے لئے یہ رائج فقرہ نا قابل قبول ہوگیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فقرہ استعمال فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم۔ صحابہ کرامؓ کا چونکہ آپ ذہن بدل چکے تھے، انھوں نے فوراً سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظلوم کی مدد کرنا تو ہم سمجھتے ہیں لیکن ظالم کی مدد کیسے ہوتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ظالم کی مدد اس طرح ہوتی ہے کہ اس کو ظلم سے روکو، اس طرح آپ ﷺ نے اسلامی ذہن کے لئے وہ حدود بتا دیئے جہاں تک مسلمان جا سکتا ہے اور جہاں سے اس کو آگے نہ بڑھنا چاہیے۔

مسلمان کو خواہ ادیب ہو خواہ شاعر ان سرحدوں کو جاننا ہوگا، اور ان کی پابندی کرنی ہوگی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں جن کو آپ ﷺ کی ہرنمائی ملی

تھی، شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ وہ اسلام کی بتائی ہوئی وسعتوں ہی میں اپنے ادب وشاعری کو چلاتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو اجازت بلکہ تائید حاصل رہتی ان کی شاعری کی وسعتوں میں مدح بھی تھی اور مرثیہ بھی، غزل بھی تھی اور ہجو بھی، واقعہ بیانی بھی تھی اور احساسات کا اظہار بھی۔ لیکن ان سب میں رعایت تھی انسانی قدروں اور اسلام کی حدوں کی ان کی اس احتیاط کو اس عہد کے مقتدر اسلامی شاعر حضرت حسان بن ثابت الانصاریؓ کے اس جملہ سے سمجھا جاسکتا ہے جو انھوں نے اس موقع پر کہا جب قریش کے بعض ایسے افراد کی طرف سے جو حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز تھے، آپ ﷺ کی ہجو کرنے کے جواب دینے کے ارادہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا کہ تم ان لوگوں کی مذمت کیسے کروگے جب کہ میں خاندانی طور پر انھیں میں سے ہوں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میں آپ ﷺ کو ان میں سے ایسا نکالوں گا جیسے گیلے آٹے سے بال نکالا جاتا ہے۔

اچھی اور موثر زبان میں مختلف رعایتوں کے ساتھ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی ہجو کی اور خوب کی اور انھوں نے اپنے ایک دوسرے شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

فان ابی و والدہ و عرضی
لعرض محمد منکم وقاء

''بلاشبہ میرے باپ اور میرے دادا خود میری آبرو یہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے لئے تمہارے حملے روکنے کے لئے سینہ سپر ہیں''

انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دفاع اور ان کے بدخواہوں کی بدخواہی کے مقابلہ کے لئے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو خوب خوب استعمال کیا اور اپنے فنی ہنر کا اظہار کیا، انھوں نے اپنی شاعری میں زور پیدا کرنے کے لئے غزل کی

اصطلاحیں اور تعبیریں بھی فصاحت وجدت طرازی کے ساتھ استعمال کیں۔اور چونکہ وہ معقول حدود سے باہر نہ تھیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا، بلکہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ اسلام کی نصرت تلوار اور تیر سے کی جاتی ہے اور شعر وشاعری سے بھی کی جانا چاہیئے۔حضرت حسان رضی اللہ عنہ اپنی اس سخن گوئی کی بنا پر شاعر اسلام اور شاعر الرسول کہلائے۔اشعار کے اندر جذبہ واحساس وتاثر کی جو ترجمانی ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اس کے صحیح انداز میں پورا محسوس کرتے تھے۔

اس کی اہم مثال وہ اشعار ہیں جو آپ ﷺ کے قریشی عزیز کو ان کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی بنا پر ان معافیوں میں شامل نہ کئے جانے پر جو فتح مکہ کے موقع پر عام طور پر دے دی گئی تھیں قتل کردیئے جانے پر ان کی بہن نے کہے تھے۔اور ادب میں آپ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے رنج والتجا کا مؤثر انداز اختیار کیا تھا۔ان کو سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تأثر کا اظہار فرمایا کہ یہ اشعار اگر پہلے سنے ہوتے تو رعایت کردیتے۔

نثر کا دائرہ قرآن مجید کے نزول سے قبل عربوں میں بہت محدود تھا۔قرآن مجید کے اثر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعہ وسیع ہوا، اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی ادبیت کا اظہار ہوا۔آپ ﷺ اس میں تمام دیگر عربوں کے لئے معلم ورہبر نظر آتے ہیں۔آپ کی تقریریں، گفتگوئیں، تذکرے اظہار تاثر، دعائیں ومناجاتیں عربی کا بہترین ذخیرۂ ادب ہیں۔اور آپ ﷺ کے زمانہ اور آپ کے زمانہ کے بعد کی نثر پر آپ ﷺ کے ادب کی نمایاں چھاپ ملتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اقسام کلام میں آپ ﷺ کے یہاں بھی تنوع ملتا ہے۔مثلاً زن وشو کے آپسی تبصروں پہ بھی ایک گفتگو آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان ہوئی تھی جو آپ ﷺ نے بیان فرمائی اور وہ حدیث

میں محفوظ ہے۔اس میں اس خاص گوشہ ادبی کی بھی نمائندگی ملتی ہے۔ یہ حدیث ام زرع کے نام سے موسوم ہے۔

احادیث کے تعلق سے ایک مثال ہمیں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقریر میں بھی ملتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے بعد انصار کے سامنے فرمائی تھی یہ وہ موقع تھا جب آپ ﷺ نے مال غنیمت کا بڑا حصہ قریش کے درمیان تقسیم فرما دیا تھا اور انصار کو اس سے محروم رکھا تھا اس پر ان کے ایک شخص کو یہ خیال پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی طرف داری کی ہے اور اس کے ساتھ جانب داری برتی ہے اور اس انصار کے قبیلہ کو جو قربانی و جاں نثاری اور فداکاری میں آپ کا شریک رہا ہے نظر انداز فرمایا اور اس کا حق پورا ادا نہ کر سکے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے انصار کو جمع فرمایا۔ آپ ﷺ ان کی اس عارضی جذباتی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقی ذہنیت کو بھی جانتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی اسی نفسیاتی کیفیت اور ذہنی حالت کی رعایت کرتے ہوئے انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

اے گروہ انصار! تمھاری سرگوشیاں اور چہ می گوئیاں کیا ہیں، تمھارے دلوں میں کچھ احساس شکایت ہے، کیا تمہیں اس کا خیال نہیں آتا کہ جب میں نبی ہو کر تمہارے پاس پہنچا تو تم گم کردہ راہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ تمہیں صحیح راستہ پر لگایا، اور تم غریب تھے اللہ تعالیٰ نے میرے واسطہ سے تمہارے لیے دولت کے ذرائع پیدا کر دیئے، تم آپس میں دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے تمہارے دلوں میں محبت واتحاد اور آپس کی الفت پیدا کر دی۔

انصاری حضرات بولے، سچ ہے احسان وکرم اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کا ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے گروہ انصار! تم نے میری بات کا جواب نہیں

دیا، انھوں نے عرض کیا! اللہ کے رسول ﷺ ہم آپ کو کیا جواب دیں؟ سب احسان وکرم ہم پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کا ہے، تب آپ ﷺ نے فرمایا دیکھو تم اگر کہنا چاہو تو کہہ سکتے ہو اور کہو گے تو سچ کہو گے اور میں تمہاری تصدیق بھی کروں گا، تم کہہ سکتے ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس اس وقت آئے جب لوگ آپ ﷺ کو جھٹلا رہے تھے، ہم نے آپ ﷺ کی تصدیق کی، لوگوں نے آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑ رکھا تھا ہم نے آپ ﷺ کی مدد کی، لوگوں نے آپ ﷺ کو وطن سے نکال دیا، ہم نے آپ ﷺ کو پناہ دی، آپ کم مائیگی میں تھے، ہم نے اپنے مال سے آپ ﷺ کی کم مائیگی دور کی، یہ سب تم کہہ سکتے ہو، اے گروہ انصار! کیا تم کو مجھ سے شکایت دنیا کی ایک چیز اور معمولی چیز پر ہو رہی ہے، وہ معمولی چیز جس کے ذریعہ میں نے ایسے کچھ لوگوں کو جو دل سے میرے قریب نہیں آ رہے تھے اسلام نہیں لائے ہیں قریب کرنا چاہا اور تم کو تمہارے ایمان واسلام پر چھوڑتے ہوئے اس میں حصہ نہیں دیا۔

اے گروہ انصار! کیا تم یہ نہیں پسند کرو گے کہ دوسرے لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تمہارا حاصل اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو جس کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو گے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے تم جو چیز لے کر لوٹو گے وہ اس چیز سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ لے کر اپنے گھروں کو جائیں گے، میرا تعلق تو تم سے ایسا ہے کہ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا (یعنی انصاری خاندان میں ہی مدینہ میں پیدا ہوتا) اگر انصار ایک راستہ اور گھاٹی میں چل رہے ہوں اور دیگر لوگ دوسرے راستہ اور گھاٹی میں چل رہے ہوں تو میں انصار ہی کے ساتھ ان کی گھاٹی میں چلوں گا اور انھیں کا ساتھ دوں گا، انصار کی مجھ سے قربت ایسی ہے جیسی لباسوں میں جسم سے وابستہ لباس کی ہوتی ہے، دوسروں کا نمبر اس کے بعد کا ہے، اے اللہ! انصار پر رحم فرما، ان کی اولاد پر رحم فرما، اور ان کی اولاد پر رحم فرما،

راوی کا کہنا ہے کہ یہ پُر اثر باتیں سن کر لوگ اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں اشکوں سے بھیگ گئیں اور وہ چلا اُٹھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حصہ میں آئے اس پر ہم پوری طرح راضی اور خوش ہیں (زادالمعاد)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام تین جہتوں سے نفسیاتی کیفیت کی رعایت پر مشتمل ہے، اول یہ کہ آپ ﷺ نے اُن کے اس جذبہ اور احساسِ تعلق کو ابھارا جو انصار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، اور وہ سب تھا جس میں اتباع کامل اسلام پر یقین اور اس کو ہر چیز پر ترجیح، پھر قربانی و جاں نثاری کا وہ جذبہ جو تمام صحابہؓ کرام میں غالب اور حاوی تھا اور اسی جذبہ نے مسلمانوں کی جماعت کو کفار کے مقابلے میں طاقت وقوت اور جلادت وصلابت عطا کر رکھی تھی اور جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ ان کے اس جذبہ کو حرکت دینے اور بیدار کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور ان سے اس کا اقرار کرالیا ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احسانات بے حد و بے شمار ہیں، تو پھر آپ ﷺ نے دوسرے پہلو پر توجہ دی، یعنی ان کی طرف سے پذیرائی خصوصی تعاون اور اخلاص کی قدر اور اس کا اقرار واعتراف فرمایا، اور ان کے ایمانی تعلق کو مؤثر ڈھنگ سے سراہا اس طرح ان کے دلوں میں جاگزیں رنج کو دور فرمایا، اس میں آپ ﷺ نے ان کے فطری بشری احساس کی پوری رعایت فرمائی اور تسلیم فرمایا کہ انھوں نے مشکل حالات میں آپ ﷺ کو خوش آمدید کہا اور آپ ﷺ کا استقبال کیا، آپ ﷺ کا ساتھ دیا اور اس محبت وایمان کے راستہ میں ہر طرح کی قربانی پیش کی، پھر جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ اُن کے دل کھل گئے اور ان میں جو شکایتی اثر پیدا ہوا تھا وہ زائل ہو گیا اور وہ اپنی سابق صفائے قلب پر لوٹ آئے تو آپ ﷺ نے انھیں ان کے ایمان کی قدر و قیمت اور قربانی وجاں نثاری میں ان کے مقام ومرتبہ سے آگاہ فرمایا، ان کے لئے دعا فرمائی، ان کی تعریف کی، اپنے لئے ان کی محبت کی قدر

شناسی فرمائی، اسے سراہا، ان پر شفقت کا اظہار فرمایا اور اپنے کو پورے اخلاص کے ساتھ ان کے اندر شامل بتایا، اور خود کو انھیں میں کا ایک فرد گردانا، ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شدت تأثر سے رو پڑے اور ان کے دلوں سے گرد و غبار چھٹ گیا، اس طرح آپ ﷺ کا کلام مخاطب کی نفسیاتی کیفیت کی رعایت کرنے کی ایک عمدہ و دلکش مثال ہے کہ گفتگو کے وقت اس کے حسب موقع طرز تخاطب استعمال کیا جائے اور اس کے لئے اس کے مناسب کیفیات کے حامل الفاظ کا انتخاب کیا جائے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں مؤثر ڈھنگ سے بات کرنے کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں اور ادب کے متنوع پہلو ملتے ہیں، مثلاً گفتگو، خطابت، حکایت، نصیحت، دعا، اظہار، تأثر اور رعایت، ذوق ادبی، ان سب اصناف سخن کی مثالیں حدیث شریف کی کتابوں میں چند در چند موجود ہیں، اور ان سیاس عہد کے لوگوں پر بڑا اثر پڑا۔ اور بہت سے ان کے اثر سے آپ ﷺ کی طرف کھنچ کھنچ کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے اصحاب نے اور تابعین پھر تبع تابعین اور بعد میں بھی آپ ﷺ کے طریقہ کی نقل کی گئی، چنانچہ خلفائے راشدین اور ان کے بعد متعدد شخصیتیں پر اثر زبان اور مؤثر کلام میں ممتاز ہوئیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہر داعی اور مصلح اپنے دعوت کے کام میں اس کی رعایت کرے یہ چیز اس کے مقاصد دعوت کے لئے موزوں اور مقصود تک پہنچنے میں معاون ہوتی ہے۔

کلام رسول ﷺ ادبی بلاغت کا شاہکار

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اپنے اندر ایک ایسا اثر انگیز ادبی مواد رکھتا ہے جس میں طاقت ور انسانی جذبہ اور رقیق انسانی تأثر کی تصویر کشی اور ادبی رعنائی و برنائی پائی جاتی ہے اور جذبۂ تأثر کے یہ نقوش خاص طور پر آپ ﷺ کی ان احادیث اور کلام میں زیادہ نمایاں ہیں جو فطری انسانی جذبات اور نفسیاتی حالات و کیفیات پر مشتمل ہے۔

یہ ادیبانہ طرز اور مؤثر و دلکش اسلوب ادبی دائرے میں بحث و نظر کے مستحق ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فنی خصائص کے ذریعہ ان شریفانہ اغراض و مقاصد کی بھی خدمت کرتے ہیں جن کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی دنیا میں بعثت ہوئی، یعنی دعوت و تربیت اور ان سے متعلق امور میں بھی ان سے بڑی مدد ملتی ہے اسی لیے ادب نبوی کا یہ پہلو اس کا مستحق ہے کہ کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے دلچسپی رکھنے والے ادباء و محققین خاص طور سے اس کی طرف توجہ کریں اور اس میں دلچسپی لیں، کیونکہ یہ زندگی کے ایک اہم پہلو کی نمائندگی کرتا اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اس پہلو کے بعض حصے اپنے پرائیویٹ اور نجی واقعات سے متعلق آپ ﷺ کے اظہار خیال کے موقع پر اور آپ ﷺ

کے ساتھ پیش آنے والے مخصوص نفسیاتی فطرت کے حامل معاملات میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ موثر اور والہانہ انداز میں آپ ﷺ کی دعاؤں میں نمایاں ہیں۔

جہاں تک اجتماعی و معاشرتی مواقع کی بات ہے، جو بعض وقت جذباتی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں تو آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کے اظہار رائے و اظہار تاثر کے مواقع پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں ملتی ہے، جو آپ ﷺ نے وفد عبدالقیس کی آمد کے موقع پر فرمایا تھا، عبدالقیس ربیعہ کا ایک قبیلہ ہے اور قبیلہ ربیعہ کے اور آپ ﷺ کے قبیلہ مُضر کے درمیان کشمکش اور چشمک مشہور و معروف رہی ہے اس چشمک کی موجودگی میں اس بات کا پورا احتمال تھا، کہ ارکان وفد کے دلوں میں (اگر ان کے ساتھ توجہ میں کمی، استقبال میں رواروی سے کام لیا گیا تو) آزردگی پیدا ہو جائے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت و نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا تدارک فرمایا، اور وفد کا استقبال ایسے جملہ سے کیا جو اس صورتحال سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکے، آپ ﷺ نے فرمایا: مرحباً بالقوم غیر خزایا ولا ندامیٰ'' آیئے آپ لوگ، آپ کو خوش آمدید ہے، آپ کو یہاں آ کر نہ ناقدری کا احساس ہوگا نہ کمتری کا اور نہ آپ کو یہاں آ کر کوئی افسوس ہوگا، اس طرح آپ ﷺ نے ارکان وفد کے قلوب میں یہ اطمینان و اعتماد پیدا کیا کہ وہ معزز اور محترم ہیں ان کی آمد دوسروں کے لیے باعث مسرت ہے، ایسا نہیں ہے جیسا کہ پہلے تھا کہ غیر ہونے کے باعث کوئی توجہ ہمدردی نہیں ملتی تھی۔

لہٰذا وہ اپنے آپ کو پردیسی اور دیار غیر میں تازہ وارد نہ سمجھیں، اور مغایرت و بے توجہی کا احساس نہ کریں، جس کا اہل عرب کے ایک کیمپ والے دوسرے کیمپ میں جا کر احساس کرتے تھے، ان کے لیے ایسا بھی نہیں کہ بعد میں وہ نادم ہوں کہ وہ

ایسے شخص کے پاس گئے جس نے ان کا اکرام واحترام نہیں کیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عزت وطاقت کی ایسی پوزیشن میں تھے کہ آپ ﷺ ان کے لیے صرف معمولی اہتمام ظاہر کرنے پر اکتفا فرما سکتے تھے اور کسی ایسے شخص یا وفد کی طرف سے جو آپ ﷺ سے لینے اور فائدہ اٹھانے کے لیے آ رہا ہو، غیر معمولی حساسیت کی کوئی پرواہ نہ کرتے، کیونکہ وہ لوگ طالب تھے اور آپ ﷺ مطلوب، وہ طلب وسوال کی پوزیشن میں تھے اور آپ عطاء وبخشش کے مقام پر فائز تھے۔

ایک دوسری مثال بزرگ ایرانی صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے لیے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "سلمان منا اهل البيت" (سلمان ہم میں سے ہیں جیسے گھر کے افراد ہوتے ہیں۔) یہ جملہ اپنے اندر جہاں مکارم اخلاق کا ایک خوبصورت اور حسین مفہوم رکھتا ہے، وہیں دوسری جانب ایسی لفظی تعبیر پر مشتمل ہے جس سے اطمینان واعتماد کا اشارہ ملتا ہے وہ لفظی تعبیر خاص طور پر "منا اهل البيت" کا کلمہ ہے اور پورا جملہ ادب نبوی کا شاہکار ہے۔ نیز اس جذباتی کیفیت سے بھی متعلق ہے۔ جو ان جیسے حالات میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوسکتی ہے، کیوں کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ عرب نہ تھے، بلکہ ایرانی تھے اور ایرانیوں اور عربوں کے درمیان نسلی تعصب بڑھا ہوا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں نازک نفسیاتی جذبہ وکیفیت کی ایک مثال ہم اس وقت پاتے ہیں جب آپ ﷺ اپنے محبوب چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے صدمہ سے دوچار ہوتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے ساتھ ایسا تعلق تھا، جس میں خاندانی وحدت وقرب سنی کا تعلق اور چچا بھتیجے کی محبت نے جذباتی ارتباط وہم آہنگی پیدا کردی تھی، ایک طرف تو وہ آپ ﷺ کے دودھ شریک اور ہم عمر تھے تو دوسری طرف

آپ ﷺ کے مشفق چچا تھے آپ ﷺ کے ساتھ ان کی محبت وشفقت کا یہ عالم تھا۔ کہ انہوں نے جب یہ سنا کہ ابوجہل نے برسرِ عام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری کی ہے آپ ﷺ کو ایذا پہنچائی ہے، اور سخت وسست کہا ہے، تو انہیں سخت طیش آیا اور ان کا جوش غضب اپنی انتہا کو پہنچ گیا، اور انہوں نے عزیز ترین بھتیجے کا انتقام لینے کے لئے ابوجہل کے ساتھ نہایت درشت معاملہ کیا اور ایسی چوٹ لگائی کہ اسے زخمی کر دیا اور بھتیجے سے اپنا تعلق ثابت کرنے کے لئے حلقہ بگوش اسلام ہونے کا اعلان کر دیا، پھر اس کو نبھایا اور تاحیات اسلام اور پیغمبر اسلام کے لئے سینہ سپر رہے اور اپنی جواں مردی وشجاعت سے آپ ﷺ کی مدد کرتے رہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ قریش کے ممتاز اور بہادر ترین نوجوانوں میں سے ایک تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے تعلق کی وجہ سے ان سے محبت فرماتے تھے، اور ان کو اپنا قوت بازو، سہارا، حامی و مددگار اور رفیق وانیس پاتے تھے۔

یہی عظیم ومحبوب چچا غزوۂ احد میں اسلام کے لئے کارہائے نمایاں انجام دینے کے بعد جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ دشمن ان کے جسم کی کاٹ پیٹ کر دیتا ہے۔ ان کی نعش کے ساتھ اہانت کا معاملہ کرتا ہے اور ان کی شکل وصورت بگاڑ دیتا ہے، اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حادثہ کا کتنا برا اثر ہوا ہوگا، اور آپ ﷺ کے قلب اطہر کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی؟ جب کہ رقت ونرمی اور شفقت و محبت آپ ﷺ کے خمیر میں شامل تھی۔ اور یہ موقع آپ ﷺ کی تکلیف اور احساس رنج کے اعتبار سے سخت ترین موقعوں میں سے تھا۔

ابن ہشام کہتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس دردناک واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی تلاش میں نکلے، چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں برساتی نالہ

(وادی) کے اندر اس حال میں پایا کہ ان کا پیٹ چاک کر کے جگر نکال لیا گیا تھا، اور ان کی لاش کا مثلہ کر دیا گیا تھا، بایں طور کہ ان کی ناک اور دونوں کان کاٹ دیئے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے لئے اس حادثہ سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں۔ میرے دل کو تکلیف وغصہ اتنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، نیز یہ بھی فرمایا کہ اگر مجھے (اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا) کا خیال نہ ہوتا کہ اس بات سے انہیں رنج ہوگا۔ اور میرے بعد یہ چیز سنت بن جائے گی۔ تو میں انہیں (حمزہؓ کو) یوں ہی بے گور وکفن چھوڑ دیتا، یہاں تک کہ انہیں درندو پرند کھا لیتے، اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی بھی لڑائی میں قریش پر غلبہ عطا فرمایا تو میں ان کے تیس آدمیوں سے بدلہ لوں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت تأثر کی وجہ سے یہ بات ارشاد فرمائی تھی۔ لیکن چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے معاملہ انتقام کے خلاف تھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل نہیں فرمایا، صرف اپنے الفاظ میں مقدار تأثر کا اظہار کیا تھا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر (غزوۂ احد میں فتح و کامرانی حاصل کر لینے کے بعد) بنی الاشہل سے تعلق رکھنے والے قبیلہ انصار کے گھروں میں سے ایک گھر پر ہوا، اور وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوحہ کرنے والیوں کا اپنے مقتولین پر گریہ وبکا اور نوحہ سنا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چشمہائے مبارک اشک آلود ہو گئیں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درد بھرے لہجہ میں فرمایا: "لکن حمزة لابواكي له" (لیکن حمزہؓ کے لئے رونے والے نہیں ہیں) چونکہ مہاجرین اپنے اپنے خاندانوں کے افراد مکہ میں چھوڑ کر آئے تھے، لہٰذا مدینہ میں ان کے افراد خاندان گنے چنے تھے پردیس میں وطن جیسے اہل قرابت کی ہمدردی کہاں ہو سکتی ہے؟ چنانچہ حضرت حمزہؓ کے اہل خاندان بھی کم تھے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہؓ

کے لئے غریب الوطنی کا اندازہ دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا، سوچنے کی بات ہے کہ رنج والم کے جذبات سے پر یہ الفاظ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، حالانکہ آپ ﷺ نبی ہیں اور بشریت کی لغزش کلامی اور خلاف اولیٰ باتوں سے پاک ہیں، لیکن خوں چکاں مصیبت کے احساس نے آپ ﷺ کو بے تاب کر دیا۔ اس جملہ سے آپ کے رنجیدہ اور زخمی قلب کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ ادھر انصار کو رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے احساس رنج اور آپ ﷺ کے ارشاد گرامی کہ "لٰکِنْ حمزہ لا بواکی لہٗ" کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم کی طرف نسبت کر کے اظہار غم کریں۔ بس پھر کیا تھا، ہر طرف حضرت حمزہؓ کے نام سے اظہار غم ہونے لگا۔ اور نالہ وغم کے الفاظ بلند ہوئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان عورتوں کے مسجد کے دروازہ پر پہنچ کر حضرت حمزہؓ کی شہادت پر اظہار غم کرتے سنا تو فرمایا: اللہ تعالیٰ انصار پر رحم فرمائے۔ انھوں نے غم خواری میں دیر نہیں کی، عورتوں سے کہو کہ واپس چلی جائیں۔

اور ابن کثیر کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں سے فرمایا: تم لوگ واپس جاؤ، اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے، اللہ تعالیٰ کی تم پر رحمت ہو، تم نے اپنی طرف سے غم خواری کا حق ادا کر دیا۔ اور جس کی چند مثالیں ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے بطور آپ کی نظروں سے گزریں۔

جو شخص کلام نبوی پر اس حیثیت سے نظر ڈالتا ہے وہ اس میں مختلف مؤثر نمونے اور بہت سے ایسے نفسیاتی پرتو پاتا ہے جن سے ایک ایسے انسان کی تصویر ہوتی ہے جو اپنی انسانی زندگی کے ہر ناحیہ میں سچا اور امانت دار، اس میں ایک نبیؑ کی بلندی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی و رسالت سے سرفراز فرمایا ہے، ایک ایسے انسان کی رقت و نرمی ہے جس نے سب کے ساتھ محبت، سب کے ساتھ سچائی اور

سب کے لئے طلب خیر کے جذبہ پر نشونما پائی ہو، ایک ایسے انسان کی سادگی ہے جو اپنے اہل وعیال اور متعلقین کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، اور ایک ایسے رسول کی عالی حوصلگی اور بلند ہمتی ہے جس نے اپنے پیغام پہنچانے اور اپنی امانت ادا کرنے کا پختہ عزم کررکھا ہو، چنانچہ نہ وہ اُکتاتا ہے، نہ تھکتا ہے، نہ بحث ومباحثہ کرتا ہے اور نہ سودے بازی کرتا ہے، بلکہ اپنی کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد اور پیہم کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَنْ لَا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ، شاید آپ ﷺ غم میں اپنی جان دے ڈالیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں، صدق اللّٰہ العظیم وصدق رسوله النبی الکریم وصلی اللہ علی نبینا ومولانا محمد وعلی آله وصحبه أجمعین۔

کلام نبوی میں

دعا ومناجات کے شہ پارے

عربی زبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موثر نثری نمونے ہیں جو سچے انسانی تاثرات، پاکیزہ و بلند پایہ قلبی احساسات اور بلیغ ترین اسلوب وطرز ادا پر مشتمل ہیں اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سراپا تقویٰ تھی اور سچے انسانی احساسات سے آراستہ تھی، آپ عربوں کے فصیح ترین قبیلے قریش میں تولد ہوئے اور فصیح ترین ہی قبیلے بنوسعد میں آپ کی نشو ونما ہوئی۔ پھر آپ ﷺ نے وحی الٰہی اور الہام سماوی کی آغوش میں تربیت پائی۔ پھر خوان قرآنی سے بہ طریق احسن کسب فیض فرمایا، بھلا اب آپ سے زیادہ پاکیزہ گفتار، شیریں کلام، راست گو اور بلیغ و موثر تعبیرات والا کون ہوسکتا تھا؟ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ کی طرف سے آپ پر بے شمار درود وسلام ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ادب پارے سب کے سب نثری ہیں۔ کیوں کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔ اس کی شہادت خود کتاب الٰہی دے رہی ہے:

"وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِىْ لَهٗ، اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ

قُرْآنٌ مُّبِیْنٌ o

''کہ ہم نے ان کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور یہ چیز آپؐ کے لئے
مناسب نہ تھی۔ آپؐ کے پاس تو ذکر الٰہی اور فصاحت و بیان کا
حامل قرآن ہے''

کلام نبوی بیک وقت سادہ بھی ہے اور پرکار بھی، اس میں بے تکلفی بھی ہے اور شیرینی بھی، چھوٹے چھوٹے جملوں میں گویا معانی کی ایک دنیا آباد ہے، محل اگر اختصار کا متقاضی ہے تو کلام موجز و مختصر ہے اور اگر ضرورت درازنفسی کی طالب ہے تو کلام طویل ہے۔ آپ ﷺ کی گفتگو تکلف و تصنع سے پاک اور رواں دواں ہوتی تھی۔ آپ نامانوس اور اجنبی کلام سے دور اور سوقیانہ، بازاری الفاظ سے نفور تھے، آپ ﷺ کا کلام ادب کی مختلف عمدہ اصناف پر مشتمل ہے، مثلاً تمثیلاتِ فائقہ، اقوالِ حکیمانہ و عالیہ، امثالِ نفیسہ، وصایائے مفیدہ، رشد و ہدایت، شریعت و تربیت اور مناجات و دعا وغیرہ، پھر ان تمام اصناف میں سب سے زیادہ پرتاثیر، اپنے رب کے حضور آپ ﷺ کی دعائیں اور مناجاتیں ہیں، یہ دعائیں اس قدر طاقتور، جامع اور پراثر ہیں کہ ان سے عربی ادب میں نہ صرف یہ کہ ایک نئی صنف کا آغاز ہوا بلکہ اس نے ادب کی طاقتور ترین صنف کا درجہ حاصل کرلیا۔ اسلوب کے لحاظ سے یہ دعائیں متین ہیں اور معنویت سے لبریز بھی، نیز دعا کرنے والے کے اندرونی احساسات، اس کے ابلتے ہوئے جذبات اور اپنے رب کے حضور اس کی لجاجت و انکساری کی عجیب و غریب بلیغانہ تصویر کشی کرتی ہیں۔

اس کی ایک مثال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعا ہے جو آپ ﷺ نے طائف میں فرمائی تھی، جہاں آپ ﷺ ایک اجنبی اور غریب الوطن کی حیثیت رکھتے تھے اور کسی حامی و مددگار کی تلاش میں تشریف لے گئے تھے۔ یہ اس وقت کی بات

ہے جب آپ ﷺ کے چچا ابوطالب وفات پا چکے تھے، جو قوم کی ایذاؤں سے آپ ﷺ کو بچاتے تھے، اور آپ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی وفات پا چکی تھیں، جو آپ ﷺ کی معاون و غم گسار تھیں، لیکن طائف جو مکہ جیسا ہی شہر تھا، وہاں کے باشندوں کے درمیان آپ کو اہل مکہ سے بھی زیادہ سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا، یعنی وہاں کے رؤساء نے آپ ﷺ کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا اور وہاں کے شرارت پسند آپ ﷺ کے پیچھے لگ گئے، پھر انھوں نے آپ ﷺ پر اس قدر پتھر برسائے کہ آپ ﷺ کے دونوں پائے مبارک لہولہان ہو گئے، اس وقت آپ ﷺ کا دل شدت الم سے چور چور تھا اور تعبِ جسمانی بھی بے پناہ تھا۔ ظالموں نے مکہ سے طائف تک کے طویل سفر کے بعد آپ ﷺ کو دم لینے کی مہلت بھی نہ دی تھی، اس لئے آپ ﷺ طائف کی آبادی سے باہر نکل کر ایک کھلی ہوئی جگہ میں بیٹھ گئے، جہاں شاید بجز آپ ﷺ کے خادم و غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ کے نہ کوئی مونس تھا نہ غم گسار۔ آپ ﷺ نے اس حال میں یہ دعا فرمائی جو آپ ﷺ کی زخموں سے چور لیکن حلیم شخصیت کی راست ادبی تصویر ہے:

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ أَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ ، وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ ،
وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ، رَبُّ
الْمُسْتَضْعَفِيْنَ اَنْتَ رَبِّيْ اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ ؟ اِلٰى بَعِيْدٍ
يَتَجَهَّمُنِيْ ، أَمْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ أَمْرِيْ؟ اِنْ لَّمْ يَكُنْ
بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا أُبَالِيْ ، غَيْرَأَنَّ عَافِيَتَكَ هِيَ
أَوْسَعُ لِيْ ، أَعُوْذُ بِنُوْرِوَجْهِكَ الَّذِيْ أَشْرَقَتْ لَهُ
الظُّلُمَاتُ وَ صَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُالدُّنْيَا وَ الآخِرَةِ، مِنْ أَنْ
يَّحِلَّ بِيْ غَضَبُكَ ، اَوْيَنْزِلَ عَلَيَّ سَخَطُكَ ، لَكَ

ﷺ پ اَلعُتبیٰ حَتّٰی تَرضٰی وَلا حَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ۔

"اے اللہ! میں اپنی بے طاقتی و ناتوانی، اپنی تدبیروں کی بے سروسامانی اور لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے وقعتی آپ ہی سے عرض معروض کرتا ہوں، اے کمزور سمجھ لئے جانے والوں کے پالنہار! آپ مجھے کس کے حوالے کرر ہے ہیں؟ کیا اس دور دراز شخص کے جو مجھ سے برہمی کے ساتھ پیش آتا ہے؟ یا آپ نے میری زمام کار کسی دشمن کو سونپ دی ہے؟ لیکن اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے ان سب کی پروانہیں ہے، مگر پھر بھی آپ کے سایہ عافیت میں میرے لئے زیادہ گنجائش ہے، میں آپ کی ذات کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں، جس سے ظلمتیں روشن ہیں اور جس کے سہارے دنیا وآخرت کے تمام امور اپنے صحیح رخ پر چل رہے ہیں، اس بات سے پناہ کہ مجھ پر آپ کا غصہ اترے اور آپ ناراضگی نازل فرمائیں، آپ ہی کا حق ہے کہ آپ کو منایا جائے تا آنکہ آپ راضی ہو جائیں، آپ کی مدد کے بغیر نہ کسی طاقت کا وجود ہے نہ قوت کا۔"

اس دعا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگارِ غالب وقادر ومہربان کے سامنے اپنی اس ناتوانی کا بیان فرمارہے ہیں جو اس وقت عملاً سامنے آئی اور وہ یہ کہ روٴسائے ثقیف کے ہاتھوں قریش کے سامنے آپ ﷺ کی ایسی بے وقعتی ہوئی جو آپ ﷺ جیسے قریشی کے لئے بالکل نئی چیز تھی، کیونکہ قبیلہٴ ثقیف کے قریش کے ساتھ قریبی روابط تھے، پھر اپنے پروردگار سے مہربانیوں کی طلب کرتے ہوئے اور اس کی جناب میں الحاح وزاری کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں:

"رَبَّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ" "اے کمزور سمجھ لئے جانے والوں کے پالنہار"

پھر اللہ سے رحمت کی خواستگاری کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

اِلیٰ مَنْ تَکِلُنِیْ ؟اِلیٰ بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ ، أم اِلیٰ عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ أمْـــرِیْ؟ "آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟ کیا اس دور دراز شخص کے جو مجھ سے برہمی کے ساتھ پیش آئے؟ یا آپ نے میری زمام کار کسی دشمن کو سونپ دی ہے؟"

پھر آپ ﷺ کو تنبہ ہوتا ہے اور آپ ﷺ تاسف و اضطراب کی کیفیت پر قابو پا لیتے ہیں۔ یہ حقیقت پیش نظر آ جاتی ہے کہ آپ ﷺ کا رب ان سب باتوں کو جانتا ہے، آپ ﷺ کا کوئی معاملہ اس سے ڈھکا چھپا نہیں ہے اور نہ وہ آپ ﷺ سے غافل ہی ہے، اسی نے تو آپ ﷺ کو منتخب فرمایا اور منصبِ رسالت پر فائز کیا ہے، نیز تبلیغِ رسالت کی ذمہ داریاں عائد کی ہیں۔ تو کیا وہ آپ ﷺ کو یوں ہی بے یارو مددگار چھوڑ دے گا؟ لیکن آخر یہ سب کچھ ہوا کیوں کر؟ کیا آپ ﷺ کا پروردگار آپ سے ناراض ہے؟ اس لئے عرض کرتے ہیں:

"إنْ لَّـمْ یَـکُـنْ بِكَ غَـضَـبٌ عَـلَیَّ فَلَا أُبَالِیْ ، غَیْرَأنَّ عَافِیَتَكَ هِیَ أوْسَعُ لِیْ"

"اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو یہ جو کچھ ہوا ہے مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ مگر پھر بھی آپ کا سایۂ عافیت میرے لئے زیادہ گنجائش رکھتا ہے۔"

پھر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے پناہ کی درخواست، اس کی عظمت و رحمت کا تذکرہ اور ہمیشہ کی رضا کا سوال کرتے ہیں، کیونکہ اس کی مدد کے بغیر نہ کسی طاقت کا وجود ہے نہ قوت کا۔

دعا ومناجات کلام انسانی کی وہ جولان گاہ ہے، جہاں صاحب دعا کے باطنی احساسات صاف نظر آتے ہیں، جہاں اس کے بے چین وغم زدہ دل کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور جہاں جذبات مجسم ہوجاتے اور الفاظ کا ایسا جامہ پہن لیتے ہیں کہ ان میں اثر انگیزی کی صفت پیدا ہوجاتی ہے، اور وہ سننے والے کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں، پھر اگر صاحب دعا کا یہ رتبہ ہو کہ زبان وبیان پر اس کی گرفت حاکمانہ ہو اور اس کا کلام بلاغت نظام، سحر حلال کا درجہ رکھتا ہو تو ایسی صورت میں قاری وسامع، صاحب دعا کے الفاظ میں اس کی روح کو چھو کر محسوس کرسکتا ہے اور اسے متحرک و بے قرار دیکھ سکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی یہی شان ہے۔ ان میں آپ ﷺ کی معجزانہ بلاغت پوری طرح جلوہ گر ہے اور یہ ایسی خصوصیات و امتیازات سے مزین ہیں، جن کا سرچشمہ قرآن پاک کی مؤثر تعلیمات ہیں، کیونکہ اگلے انبیاء ورسل کی دعاؤں اور مناجاتوں کے مؤثر قرآنی نمونے آپ پر نازل ہوئے اور آپ ﷺ نے انھیں کی آغوش میں تربیت پائی، پھر آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف احوال کے دوران یہ دعائیں منصۂ شہود پر آئیں۔ یہ دیکھنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے باطنی احساسات کی تصویر کشی اور فن کارانہ ترجمانی کس طرح فرمائی ہے؟ اس کی ایک مثال تو وہ دعا تھی، جس کا ذکر طائف کے سلسلے میں گزر چکا، دوسری مثال دعائے بدر ہے۔ اس دن بھی آپ ﷺ پر بے چینی اور اضطراب کی اثر انگیز کیفیت طاری تھی، اس دن مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں پہلی بار دشمنان اسلام کے مقابل صف آرا ہوئے تھے۔ یہ اسلام کے حق میں ایک فیصلہ کن دن تھا۔ وہ اسلام جس کی تبلیغ اور استحکام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام صلاحیتیں لگا دی تھیں، اس کے بچاؤ کی تدبیریں کی تھیں اور اس کی راہ میں آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے

نیکوکار صحابہؓ نے ہر طرح کی اذیتیں جھیلی تھیں، یقیناً یہ ایک عظیم الشان اور فیصلہ کن دن تھا۔ اس دن کفار مکہ نکل کھڑے ہوئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ اپنی تمام تر طاقت وقوت اور شان وشوکت کا مظاہرہ کریں اور اسلام کے خلاف جو کچھ کر سکتے ہیں، کر گذریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حریف کے مقابل اپنے لشکر کو صف آرا کیا اور مقدور بھر تیاری اور ساز وسامان کی فراہمی کی، پھر تنہائی میں ایک چھپر تلے اپنے رب کے حضور مصروف دعا ومناجات ہو گئے، وہاں بجز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اور کوئی نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت تھی کہ آپ ﷺ اپنے رب سے اس مدد کی طلب فرما رہے تھے جس کا اللہ کی طرف سے وعدہ تھا دعا کے درمیان زبان مبارک پر یہ کلمات جاری تھے۔

اَللّٰھُمَّ إِنْ تُھْلِكْ ھٰذِهِ الْعِصَابَةَ الْیَوْمَ فَلَنْ تُعْبَدْ

''اے اللہ! اگر آج کے دن یہ مٹھی بھر جماعت مٹ گئی تو پھر آپ
کی عبادت نہ کی جاسکے گی''

پھر آپ ﷺ کی مناجات اور الحاح وزاری اس قدر بڑھ گئی کہ آپ ﷺ کے رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بے چین ہو کر کہہ اٹھے۔ اے اللہ کے نبی! اب بس کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے کئے ہوئے وعدے کو ضرور پورا فرمائے گا۔

دعائے بدر کے سلسلے میں راویوں سے یہی چھوٹا سا جملہ منقول ہے، جسے آپ ﷺ کے الحاح واضطراب کی ایک علامت اور سلگتے ہوئے احساسات کی ترجمانی کہہ سکتے ہیں۔ اگر دعا کی پوری عبارت منقول ہوتی، جس کا یہ جملہ ایک جزو ہے، تو وہ شدت تاثیر اور خوبی ادا کی ایک مثال ہوتی، اس کا کسی قدر اندازہ ہم آپ ﷺ کی ایک دوسری دعا، دعائے عرفات سے لگا سکتے ہیں، یہ دعا آپ ﷺ کے احساساتِ قلب بریاں کی تصویر اور رب العالمین کے حضور حسیت عبودیتِ خالصہ

کی تعبیر ہے۔اس دعا کے الفاظ میں ایک خاص طرح کی متانت وجزالت اور اسلوب میں نرمی ولطافت پائی جاتی ہے، عرض کرتے ہیں:

"اللّٰھُمَّ إنَّکَ تَسمَعُ کَلاَمِیْ، وَتَرٰی مَکَانِیْ، وَتَعْلَمُ سِرِّیْ وَعَلاَنِیَتِیْ، لاَیَخْفٰی عَلَیْکَ شَیْئٌ مِّنْ أَمْرِیْ."

''اے اللہ! آپ میری باتوں کو سن رہے ہیں، میری صورت حال کو دیکھ رہے ہیں، میرا باطن وظاہر آپ کے علم میں ہے، میرا کوئی معاملہ آپ سے مخفی نہیں''

اس کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حضور اپنی کھلی ہوئی ناتوانی کا اعتراف فرمارہے ہیں، کیونکہ وہ آپ ﷺ کو دیکھ رہا ہے۔ آپ ﷺ کی باتیں سن رہا ہے اور آپ ﷺ کا کوئی معاملہ اس سے پوشیدہ نہیں ہے، بات یہ ہے کہ اپنے رب کے حضور، بندے کی حالت وکیفیت دوسرے تمام احوال وکیفیات سے غایت درجہ مختلف ہوتی ہے، اسے نہ کسی بادشاہ اور اس کی رعایا کی وضع وکیفیت کے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اور نہ کسی آقا اور اس کے کسی غلام کی صورتِ حال کے مماثل ہی قرار دے سکتے ہیں۔ یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ رب العالمین کی بارگاہ میں اس کا ایک بندہ حاضر ہے، جسے اپنے رب کی کامل وہمہ جہت ربوبیت پر پورا ایمان اور اس کے وسیع ودقیق علم اور قدرت کاملہ پر کلی اعتماد ہے۔اس کے بعد آپ ﷺ نے اس دعا میں رب عظیم کے سامنے اپنی حالت زار کی تصویر پیش کی ہے۔ چنانچہ عرض کرتے ہیں:

أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ، الْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْرُ۔

''میں ہوں بے چارہ مصیبت زدہ محتاج، فریادی، پناہ جو''

آپ ﷺ نے ان کلمات کے ذریعے، اس اشارۂ ربانی کی موافقت فرمائی

ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب الٰہی کی ایک سورہ میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۙ"

آگے فرماتے ہیں:

"اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۠ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۠ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۭ"

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے وقت چاشت اور وقت صبح کو اس بات کا گواہ بنایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کا معاملہ توجہ خصوصی اور رحمتِ خاص کا ہے، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے حالتِ احتیاج و ناتوانی میں وسائل زندگی فراہم کئے، اس لئے کہ آپ ﷺ بہ وقت ولادت باپ کی طرف سے یتیم تھے اور نشو ونما کا زمانہ آیا تو ماں کی طرف سے بھی یتیم ہو گئے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تلف ہونے سے بچایا، پھر جب آپ ﷺ کا کوئی رہنما نہ تھا تو منصبِ نبوت سے سرفراز کر کے ہدایت کے راستوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی، اسی طرح آپ حالت احتیاج میں تھے کیونکہ وراثت میں آپ ﷺ کو نہ کوئی مال ہاتھ آیا تھا نہ دولت، پھر آپ ﷺ کا کوئی کفیل بھی نہ تھا، کیونکہ آپ ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہی والد وفات پا چکے تھے اور ابھی عہد طفولیت ہی تھا کہ والدہ بھی چل بسیں، پھر کم سنی ہی میں دادا کا بھی انتقال ہو گیا، اس طرح جب آپ ﷺ نے رواں دواں زندگی کے حدود میں قدم رکھا تو آپ ﷺ پوری احتیاج و بے سروسامانی میں تھے، لیکن رب رؤف نے آپ کی دست گیری فرمائی اور آپ ﷺ کے لئے اسباب غنٰی فراہم کر دیئے، تلاوتِ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا ہی اس

لئے آپ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں ان تمام امور کوملحوظ رکھا ہے، عرض کرتے ہیں:

"أَنَا البَائِسُ الفقيرُ، المُسْتَغِيثُ الْمُسْتَجِيرُ"

پھر جب آپ ﷺ کی نگاہ تبلیغ رسالت کی اس عظیم ذمہ داری کی جانب ملتفت ہوئی، جو آپ ﷺ کے دوش مبارک پر ڈال دی گئی تھی، اور جس کے بوجھ تلے پشتِ مبارک گویا ٹوٹی جارہی تھی، اس کے ساتھ ہی جب آپ ﷺ نے راہ تبلیغ میں اپنی کوششوں کا جائزہ لیا اور انھیں درجۂ مطلوب سے کمتر تصور فرمایا، تو آپ ﷺ خشیت طاری ہوگئی، آپ ﷺ سہم گئے اور اعترافِ خطا کا اعلان فرماتے ہوئے مصروف دعا ہو گئے:

"الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهِ"

''میں ہی ہوں اپنی خطاؤں کا معترف اور مقر''

پھر آپ ﷺ نے احساس ناتوانی واحتیاج اور اعتراف قصور وخطا کی اس فضا میں کامل درجہ الحاح وزاری کے ساتھ عرض کیا:

"أَسْأَلُكَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِينِ وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ إِبْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيلِ وَ أَدْعُوكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ دُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهُ، وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهُ، وَرَغِمَ لَكَ أَنْفُهُ"

''میں ایک بڑے بے کس کی طرح آپ سے سوال کرتا ہوں اور اس شخص کی طرح گڑگڑاتا اور آہ وزاری کرتا ہوں جو خطا کار بھی ہو اور رسوا و بے عزت بھی، اور خوف زدہ آفت رسیدہ شخص کی طرح آپ کو پکارتا ہوں، جس کی گردن آپ کے آگے جھکی ہوئی ہو اور اس کے آنسو بہ رہے ہوں اور جس کا بدن احساس ذلت

سے دبا جا رہا ہو اور جو کہ احساس ندامت سے ناک رگڑ رہا ہو۔''

اس حالت سے بڑھ کر فروتنی اور لجاجت کی اور کون سی حالت ہوگی، جو ایک بے کس، خوف زدہ اور آفت رسیدہ کی حالت ہے، جس میں ناتوانی، بیکسی اور تحیر کی تمام کیفیات جمع ہوگئی ہیں اور جس کی ترجمانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رب قادر و جلیل کی ربوبیت کے سامنے عبدیت کاملہ کا اظہار کرتے ہوئے فرمائی ہے، آپ ﷺ اپنی دعا میں آگے فرماتے ہیں:۔

اللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِیْ بِدُعَائِكَ شَقِیًّا، وَكُنْ بِیْ رَءُوْفًا رَّحِیْمًا ، یَا خَیْرَ الْمَسْئُوْلِیْنَ وَیَاخَیْرَ الْمُعْطِیْنَ ۔

''اے اللہ! میں نے یہ دعا جو آپ سے کی ہے، اس میں مجھے ناکام نہ بنایئے، مجھ پر مہربان و رحیم ہو جایئے، اے ان سب سے بہترین جن سے مانگا جائے اور اے ان سب سے بہتر جو دے سکتے ہوں''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کے ذریعہ اپنے رب کو پکارا ہے، اس سے سرفرازی رحمت اور مہربانی کی درخواست کی ہے اور ناکامی و اتلاف سے حفاظت چاہی ہے۔

اب آپ ﷺ کے سامنے یہ دعا مکمل اور مسلسل صورت میں پیش کی جاتی ہے آپ ﷺ دیکھیں گے کہ اس کی عبارت میں ایک خاص طرح کی ہم آہنگی اور مسحور کن حسن ہے، اسی طرح ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی جانب منتقل ہونے کا عمل بھی فطری محسوس ہوتا ہے، آپ ﷺ عرض کرتے ہیں:

اللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِیْ ، وَتَرٰی مَكَانِیْ ، وَتَعْلَمُ سِرِّیْ وَ عَلَانِیَتِیْ، لَایَخْفٰی عَلَیْكَ شَیْءٌ مِنْ

أَمْرِیْ، وَأَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ، الْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْرُ، الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ، الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِهٖ، أَسْأَلُكَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِیْنِ وَاِبْتَهِلُ إِلَیْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِیْلِ وَ أَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِیْرِ، دُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ، وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهٗ، وَرَغِمَ لَكَ أَنْفُهٗ، اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِیْ بِدُعَاءِكَ شَقِیًّا، وَكُنْ بِیْ رَءُوْفًا رَحِیْمًا، یَا خَیْرَ الْمَسْئُوْلِیْنَ وَ یَاخَیْرَ الْمُعْطِیْنَ۔

''اے اللہ! آپ میری باتوں کو سن رہے ہیں، اور میری صورت حال دیکھ رہے ہیں میرے باطن وظاہر سے واقف ہیں، میری کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں ہے، میں ہوں مصیبت زدہ محتاج، فریادی، پناہ جو، ترساں، ہراساں، اپنی خطاؤں کا مقر اور معترف، میں آپ سے بے کس کی طرح سوال کرتا ہوں، ذلیل گناہ گار کی طرح آپ کے آگے گڑگڑاتا ہوں۔ خوف زدہ آفت رسیدہ کی طرح آپ کو پکارتا ہوں، اس شخص کی پکار کی طرح جس کی گردن آپ کے آگے جھکی ہوئی ہو، اس کے آنسو آپ کے لئے بہہ رہے ہوں، وہ فروتنی کئے ہوئے ہو اور آپ کے آگے اپنی ناک رگڑ رہا ہو، اے اللہ مجھے اس دعا میں ناکام نہ بنایئے، مجھ پر مہربان ورحیم ہوجائیے، اے مانگے جانے والوں میں سب سے بہتر اور اے دینے والوں میں سب سے بہتر۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو ''مغز عبادت'' بتلایا ہے، فی الواقع یہ دعا کی بہت عمدہ تعریف ہے، اس لئے کہ دعا ایک ایسا عمل ہے جس کے تمام گوشے

اور راوی بے روح عبودیت سے معمور ہوتے ہیں، اسی طرح دعا صاحبِ دعا کے ذہن و دماغ کو اپنے خالق و پروردگار سے حد درجہ قریب کر دیتی ہے، چنانچہ دعا خواں جب اخلاص وطمانیت کے ساتھ اپنے رب سے محو مناجات ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ اپنے پروردگار کے سامنے جھکا ہوا ہے اور بار بار اسے دیکھے جا رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت کی تعبیر کلمہ ''احسان'' سے فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''احسان'' یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو یہ حقیقت ہی ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی یہی کیفیت تھی۔ رہ گئیں آپ ﷺ کی دعائیں اور مناجاتیں تو وہاں یہ کیفیت قوی ترین شکل میں ظاہر ہوتی تھی، چنانچہ آپ ﷺ جب مصروف دعا ہوتے تھے تو ایسا لگتا تھا گویا اس جانی پہچانی دنیا سے نکل کر کسی اور دنیا میں تشریف فرما ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ دعائیں جو اسلوب و ادا کے لحاظ سے ان قرآنی دعاؤں سے بہت قریب ہیں، جن کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یا تو آپ ﷺ کی تعلیم کے لیے فرمایا، یا انبیاء سابقین کی دعاؤں کے سیاق میں کیا ہے، آپ ﷺ کی ان دعاؤں کا جائزہ لیا جائے تو قلبِ انسانی ان کی قدر و قیمت کے احساس سے معمور اور ان کے زیر اثر پیدا شدہ فضا کی بلند پائیگی سے مسحور ہو جاتا ہے، گویا ایک آواز ہے جو کسی اور دنیا سے آ رہی ہے، جہاں تک ان دعاؤں کے اسلوب اور طرز ادا کا تعلق ہے تو وہ بہت ہی خوبصورت اور لطیف ہے، پرکار اور سادہ ہے، کبھی چشمۂ صافی کی طرح سبک خرام اور کبھی چٹانوں کے درمیان سے گزرنے

والے پرشور دریا کی مانند تیز گام، اب ہم آپ ﷺ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے چند مسلسل اور مربوط نمونے پیش کرتے ہیں، جو آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں اپنے رب کے حضور کی ہیں، یہ شرح و ترجمانی سے بے نیاز ہیں :

اللّٰهُمَّ فَارِجَ الْهَمِّ، كَاشِفَ الْغَمِّ، مُجِيبَ دَعْوَةِ الْمُضْطَرِّينَ رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَرَحِيمَهَا ، أَنْتَ تَرْحَمُنِي فَارْحَمْنِي بِرَحْمَةٍ تُغْنِينِي بِهَا عَنْ رَحْمَةٍ مِّنْ سِوَاكَ۔

''اے ہموم وافکار کے دور کرنے والے! غم والم کے زائل کرنے والے! مجبوروں و بے بسوں کی پکار سننے والے! اہل دنیا کے رحمٰن ورحیم! آپ ہی مجھ پر رحم کریں گے تو آپ ایسی رحمت نازل فرمایئے جو مجھے دوسروں کے رحم وہمدردی سے بے نیاز کردے''

اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ ، وَإِلَيْكَ الْمُشْتَكٰى ، وَبِكَ الْمُسْتَغَاثُ ، وَأَنْتَ الْمُسْتَعَانُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ۔

''اے اللہ! حمد کا استحقاق آپ ہی کو ہے، تکلیف و مصیبت کا عرض معروض آپ ہی سے کیا جاتا ہے، فریا درس آپ ہی کی ذات ہے۔ مدد آپ ہی سے طلب کی جاسکتی ہے۔ طاقت وقوت آپ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں۔''

اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْكَ، لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ اللّٰهُمَّ إِنَّا

نَعُوذُبِكَ مِنْ أَنْ نَزِلَّ أَوْنُزِّلَ، أَوْنُضِلَّ ، أَوْنَظْلِمُ أَوْيُظْلَمُ عَلَيْنَا، أَوْنَجْهَلَ أَوْيُجْهَلَ عَلَيْنَا، أَعُوْذُبِنُوْرِ وَجْهِكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ أَضَاءَ تْ لَهُ السَّمٰوٰاتُ ، وَاشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَصَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُالدُّنْيَا وَ الآخِرَةِ أَنْ تَحِلَّ عَلَيَّ غَضَبُكَ ، وَ تَنْزِلَ عَلَيَّ سَخَطُكَ ، وَلَكَ الْعُتْبٰى حَتّٰى تَرْضىٰ ، وَلَا حَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّابِكَ ، اَللّٰهُمَّ وَاقِيَةً كَوَاقِيَةِ الْوَلِيْدِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ الْأَعْمِيَيْنَ السَّيْلِ وَالْبَعِيْرِ الصَّئُوْلِ۔

''اے اللہ! میں پناہ چاہتا ہوں آپ کی رضا کی، آپ کی ناخوشی سے، آپ کے عفو کی، آپ کی عقوبت سے اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں خود آپ سے، میں آپ کی تعریف کا حق نہیں ادا کر سکتا۔ آپ اسی تعریف کے مستحق ہیں، جو آپ نے اپنی ذات کی خود فرمائی ہے، اے اللہ! ہم آپ کی پناہ چاہتے ہیں پھسل جانے سے یا کسی کو پھسلانے سے، یا کسی کو گمراہ کرنے سے یا کسی پر ظلم کرنے سے، یا خود نشانہ ظلم بننے سے، یا جہالت کرنے سے، یا کسی کی جہالت کا شکار بننے سے، یا گمراہ ہونے سے، یا گمراہ کئے جانے سے، میں پناہ چاہتا ہوں آپ کی ذات گرامی کے نور کی، جس سے آسمان روشن ہیں، ظلمتیں تاباں ہیں اور جس کے سہارے دنیا و آخرت کے تمام امور اپنے صحیح رخ پر چل رہے ہیں، اس بات کی پناہ کہ مجھ پر آپ کا غصہ ہو، یا آپ اپنی ناخوشی مجھ پر ظاہر کردیں، آپ ہی کا حق ہے کہ آپ کو منایا جائے، تا آنکہ

آپ راضی ہوجائیں، آپ کی مدد کے بغیر نہ طاقت ہے، نہ قوت۔اے اللہ! جس طرح کسی بچے کی نگہبانی کی جاتی ہے،بس ایسی ہی آپ سے نگہبانی چاہتا ہوں۔اے اللہ! مجھے دواندھا دھند باتوں یعنی سیلاب اور حملہ آور اونٹ کے شر سے اپنی پناہ میں لے لیجئے۔"

رَبِّ أَعِنِّیْ وَلَا تُعِنْ عَلَیَّ، وَانْصُرْنِیْ وَلَا تَنْصُرْ عَلَیَّ، وَامْكُرْلِیْ وَلَا تَمْكُرْ عَلَیَّ، وَاهْدِنِیْ وَیَسِّرِ الْهُدٰی لِیْ، وَانْصُرْنِیْ عَلٰی مَنْ بَغٰی عَلَیَّ، رَبِّ اجْعَلْنِیْ لَكَ ذَاكِرًا، لَكَ شَاكِرًا، لَكَ رَاهِبًا، لَكَ مِطْوَاعًا، لَكَ مُطِیْعًا، إِلَیْكَ أَوَّاهًا مُنِیْبًا، رَبِّ تَقَبَّلْ تَوْبَتِیْ، وَاغْسِلْ حَوْبَتِیْ، وَأَجِبْ دَعْوَتِیْ، وَثَبِّتْ حُجَّتِیْ، وَسَدِّدْ لِسَانِیْ، وَاهْدِ قَلْبِیْ، وَاسْلُلْ سَخِیْمَةَ صَدْرِیْ۔

"اے پروردگار! میری مدد کیجئے اور میرے برخلاف مدد نہ کیجئے، مجھے کامیابی دیجئے اور میرے برخلاف کامیابی نہ دیجئے، میرے لئے تدبیر فرمایئے اور میرے برخلاف تدبیر کو کامیاب نہ بنائیے، مجھے ہدایت دیجئے اور میرے لئے راہ ہدایت کو آسان کردیجئے جو مجھ پر زیادتی کرے اس کے خلاف میری مدد فرمائیے، اے اللہ! مجھے ایسا بنادیجئے کہ میں آپ کو بہت یاد کیا کروں، آپ کا بڑا شکرگذار بنوں، آپ سے بہت زیادہ ڈرتا رہوں، آپ کا بہت زیادہ فرمانبردار بنوں، آپ کا بہت زیادہ اطاعت گزار بنوں، آپ ہی سے سکون پانے والا بنوں اور آپ ہی کی طرف متوجہ

ہونے والا اور رجوع کرنے والا رہوں، اے پروردگار! میری توبہ قبول فرمائیے میرے گناہ دھو دیجئے، میری پکار سن لیجئے میری حجت قائم رکھئے میری زبان درست رکھئے، میرے دل کو ہدایت دیجئے، اور میرے سینے کی کدورت نکال دیجئے۔"

اَللّٰهُمَّ أَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِنَا، وَأَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا، وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ، وَنَجِّنَا مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ، وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَبَارِكْ لَنَا فِيْ أَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَأَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا، وَتُبْ عَلَيْنَا، إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، وَاجْعَلْنَا شَاكِرِيْنَ لِنِعْمَتِكَ، مُثْنِيْنَ بِهَا، قَابِلِيْهَا، وَأَتِمَّهَا عَلَيْنَا۔

"اے اللہ! ہمارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دیجئے۔ ہمارے باہمی تعلقات درست فرما دیجئے، ہمیں سلامتی کی راہیں دکھلائیے، ہمیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف پہنچا دیجئے، ہمیں ظاہری و باطنی بے حیائیوں سے دور رکھئے، برکت عطا فرمائیے ہماری شنوائیوں میں ہماری بینائیوں میں، ہمارے قلوب میں، ہماری ازواج میں اور ہماری اولاد میں، ہماری توبہ قبول فرمائیے کہ آپ ہی ہیں بار بار توبہ قبول فرمانے والے اور نہایت مہربان، ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر گذار، ثناخواں اور ان کا اہل بنائیے اور ہم پر اپنی نعمتیں پوری پوری اتار دیجئے"

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ، وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ، وَمِنَ

الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا ، وَمَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَا، وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا ،وَاجْعَلْ ثَأْرَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا، وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا، وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا، وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا، وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا ، وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا۔

''اے اللہ! ہمیں اپنی خشیت سے اتنا بہرہ مند فرمایئے کہ وہ ہمارے اور آپ کی نافرمانیوں کے درمیان حائل ہو جائے، اور اپنی طاعت سے اس قدر حصہ دیجئے کہ اس کے ذریعہ آپ ہمیں اپنی جنت تک پہنچا دیں، اور ایمان و یقین سے اس حد تک بہرہ ور فرمایئے کہ اس کے ذریعے آپ دنیا کی مصیبتیں ہم پر سہل فرما دیں، جب تک ہمیں زندہ رکھئے ہمیں ہماری شنوائیوں، بینائیوں اور قوتوں سے مالا مال رکھئے، اسے ہمارا وارث بنائے، جو ہم پر ظلم کرے اس سے ہمارا انتقام لیجئے، جو ہم سے دشمنی کرے اس کے مقابل ہماری مدد فرمایئے، ہماری مصیبتیں ہمارے دین سے متعلق نہ فرمایئے، دنیا کو ہمارا محور، ہمارے علم کی معراج اور ہماری غایت محبت کا درجہ نہ دیجئے، بے رحموں کو ہم پر مسلط نہ فرمایئے۔''

اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا، وَأَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا، وَأَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَ آثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا ، وَأَرْضِنَا وَارْضَ عَنَّا۔

''اے اللہ! ہمیں بڑھائیے، ہمارے اندر کمی نہ فرمائیے، ہمیں باآبرو رکھئے رسوا نہ کیجئے، ہمیں نوازیئے محروم نہ رکھیے، ہمیں مقدم رکھئے، ہمارے برخلاف ترجیح نہ دیجئے، ہمیں خوش کردیجئے، اور ہم سے خوش ہو جائیے۔''

اللّٰھُمَّ لَا تَدَعْ لَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ، وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا دَيْنًا اِلَّا قَضَيْتَهٗ، وَلَا حَاجَةً مِّنْ حَوَائِجِ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

''اے اللہ! ہمارا کوئی گناہ باقی نہ رہنے دیجئے، معاف فرمائیے، کچھ ہموم وافکار باقی نہ رہنے دیجئے دور کردیجئے، کوئی قرض باقی نہ رکھئے چکا دیجئے اور دنیا وآخرت کی تمام ضروریات پوری فرمادیجئے اے ارحم الراحمین۔''

میں دعاہائے نبوی کے انھیں شہ پاروں پر اکتفا کرتا ہوں، جو ہیں تو بہت زیادہ لیکن یہاں تھوڑی مقدار میں پیش کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ ہمیں اپنی فرمانبرداری اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کی توفیق نصیب فرمائے اور اسوہ نبوی کو اپنانے کی، صحیح ایمان اور جذبہ سے دعا کرنے کی کوششوں میں کامیاب کرے، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الآخِرَ وَذَكَرَاللّٰهَ كَثِيْرًا۔"

''تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔''

گناہوں سے برگشتگی اور طاعات کی قوت اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر متصور نہیں۔ اللہ تعالیٰ گناہوں سے برگشتگی کی توفیق وطاعات کی رغبت وقوت دے۔

وصلی اللّٰہ تعالی علی سید الخلق وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ وسلم تسلیماً کثیرًا کثیرًا۔

---

(۱) ترجمہ از عربی: مولوی ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی (ماخوذ از مقالات حمد ومناجات ودعاء۔ مطبوعہ دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ہجرت نبوی ﷺ

ہماری زندگی میں سب سے زیادہ عزیز اور پسندیدہ چیز جاہ و مال ہوتی ہے، جاہ تو یہ ہے کہ ہم چشموں میں عزت رہے، نام رہے، پھر یہ عزت مزید بڑھے اور بڑھتی رہے، نام بڑھے اور مشہور ہوتا چلا جائے، ہمارے نفس کی اکثر تگ ودو اسی میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور بڑے بڑے صاحب فہم و فراست اسی زلفِ پیچاں میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس کے لئے جان و مال تک داؤں پر لگا دیتے ہیں، پھر مال کا معاملہ یہ ہے کہ زندگی کی سہولتیں، راحتیں چونکہ بالعموم اس سے وابستہ ہوتی ہیں، اس لئے آدمی اس کے لئے جدوجہد کرتا رہتا ہے، پھر یہ اس کا شوق بن جاتا ہے خواہ وہ اس کے زیادہ کام نہ آسکے، لیکن اس کا مالک بننا اور یہ احساس کہ ہمارے پاس اتنی دولت ہے ہم اس کے مالک و مختار ہیں، ایک نشہ کی کیفیت رکھتا ہے، اس کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ، اگر آدم کے بیٹے کو ایک میدان بھر کر سونا مل جائے تو وہ چاہے گا کہ دو میدان بھر کر مل جائے اور اگر دو میدان بھر کر مل جائے تو چاہے گا کہ تین میدان بھر کر ملے، پھر فرمایا کہ آدم کی اولاد کا پیٹ تو مٹی ہی بھرتی ہے۔

دوسری طرف واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی تمام امنگیں، رعنائیاں، خواہشات،

تقاضے، جاہ و مال کی طلب میں وارفتگی، سب کی سب آنکھ بند ہونے پر ختم ہو جاتی ہیں، اور انسان کا وہ پیٹ جو چاندی سونے کے ڈھیروں سے نہیں بھر سکا تھا صرف قبر کی تھوڑی سے مٹی سے بھر جاتا ہے۔

یہ وقت سخت وقت ہوتا ہے، انسان اپنے تمام مال ومتاع، اپنی عزت وشہرت سے اس طرح ہاتھ جھاڑ کر چند فٹ کی جگہ میں سما جاتا ہے جیسے کہ وہ نہ کسی چیز کا مالک تھا اور نہ کسی کشادہ و باعزت جگہ پر متمکن۔

اسلام نے مسلمان کو اس دن اور اس انجام سے غافل ہونے سے منع کیا ہے، اور یاد دلایا ہے کہ سب کو اسی راہ سے گزرنا ہے، اس کا نہ صرف فکر و دھیان رکھنا ضروری ہے بلکہ اس کے لئے تیاری بھی کرنا ضروری ہے، اس سلسلہ میں صرف نصیحت وتاکید پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اس کی مشق کے لئے مختلف عمل مقرر فرمائے۔ مثلاً روزہ ہے اس میں نفس کی رغبتوں اور بعض سہولتوں سے وقتی طور پر انقطاع اختیار کرنے کا نظام مقرر فرمایا، حج ہے، اس میں اپنے گھربار سے کچھ مدت کے لئے دور اور مسافرت کی دشواریوں کو گوارا کرنے کا نظام مقرر فرمایا۔ صدقہ زکوٰۃ ہے، اس میں اپنے مال میں سے کچھ حصہ نکال کر دوسرے کو دینے کا عمل مقرر فرمایا اور ان سب اعمال میں جذبہ یہ رکھا کہ وہ مرنے کے بعد کام آئے، یہ وہاں سامان و مدد کا ذریعہ بنے جہاں جانے والا اپنے ساتھ کوئی دنیاوی سامان و وسائل نہیں لے جاتا، جہاں وہ ان چیزوں سے ہاتھ جھاڑ کر جاتا ہے اس سلسلہ میں سب سے بڑی اور دور رس مشق صحابۂ کرامؓ کو ہجرت کے عمل کے ذریعہ کرائی گئی، اس میں اپنے پروردگار کے راضی رکھنے کے لئے، آدمی اپنے گھربار کو چھوڑ کر اجنبیوں کے درمیان اور اجنبی ماحول میں منتقل ہو جاتا ہے، اگر معاملہ چند روز کا ہو تو بھی غنیمت ہے، معاملہ تو زندگی بھر کا ہے جس میں اپنی پرانی جگہ پر لوٹنا نہیں ہے اگر کبھی لوٹنا ہے تو صرف محدود وقت

کے لئے اور صرف مسافروں کی طرح۔

وطن کی وہ فضائیں جن میں بچپن بسا ہوا ہو، وہ ماحول جس سے قلب و ذہن مانوس رہا ہو، وہ فوائد جن سے زندگی کی سہولتیں وابستہ رہی ہوں، بالکل ترک کر دینا، ان کے مساوی یا ان سے بہتر متبادل کے لئے نہیں بلکہ محض خدا کو راضی کرنے کے لئے، اور ایک مبہم، مشکوک و نا معلوم مستقبل کے لئے، یہ وہ قربانی ہے جس کا درجہ جہاد کے علاوہ (جس میں جان کی قربانی) ہر عمل سے بڑھ جاتا ہے، چنانچہ جن صحابہ کو ہجرت کی سعادت حاصل ہوئی انہوں نے بڑا مقام پایا، کیوں کہ یہ مشکل ترین کام تھا۔

ہجرت نہ صرف یہ کہ ایک مشکل اور عظیم عمل تھا بلکہ وہ تربیت و تشلیل سیرت کا ایک بہت اچھا ذریعہ بھی تھا، ہجرت کے ذریعہ جو قربانی دینی پڑتی ہے وہ معمولی نہیں، یہ قربانی انسانی سیرت کی تعمیر کا بہترین ذریعہ بنتی ہے اس قربانی کے بعد سیرت کا وہ پہلو مکمل ہوتا ہے جس کی تکمیل سب سے زیادہ مشکل ہے، یعنی پسند اور راحت کو نظر انداز کر کے نئے حالات کو قبول کرنا، نئے حالات میں از سر نو حفاظت، عزت، اور ضروریات حیات کے لئے محنت کرنا، اور نئی دنیا اور نئے ماحول میں اپنی جگہ بنانا ہوتا ہے، پھر یہ نئی جگہ پرانی جگہ سے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ یہ وراثت میں نہیں حاصل ہو جاتی، اعزہ کے تعاون سے نہیں ملتی، پھر اگر ہجرت صحیح ہجرت ہے تو اس کے لئے ہر طرح کے وسائل نہیں اختیار کئے جا سکتے، اس کے لئے پاکیزہ محتاط اور خشیت الٰہی سے مزین مزاج اور طریقۂ عمل اختیار کرنا پڑتا ہے، اسی لئے اسلام میں ہجرت کا عمل بڑا عظیم عمل ہے، اس سلسلہ میں وہ حدیث نبویؐ بڑی نصیحت رکھتی ہے کہ:

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ

رہیں، اور ہجرت کرنے والا وہ ہے جو اُس بات کو ترک کر ے
جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے۔"

اور ہر سال ربیع الاول کا مہینہ ہم کو یہ عظیم عمل اور عظیم قربانی یاد دلاتا ہے، ربیع الاول کا مہینہ ہم کو یہ پیغام سناتا ہے کہ ہمارے رہبر اعظم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وطن کو، خاندان کو، اور اپنے محبوب مرکز عبادت کعبہ کو اپنے پروردگار کی تابعداری بطریق احسن قائم رکھنے کے لئے چھوڑا، اور ایک نئے شہر میں، نئے ماحول میں مختلف النسب افراد کے درمیان اپنا مرکز بنایا، ان کے ساتھ تمام مسلمانانِ مکہ نے یہی قربانی دی، یہ قربانی اللہ کے لئے تھی، اور مال ومتاع اور جاہ منزلت سب کی تھی، پھر اسی قربانی سے ان کو نعم البدل ملا اور اسی سے ان کو طاقت، جاہ وعزت حاصل ہوئی، اسلام کی اصل اور مضبوط تاریخ کی ابتدا اسی واقعہ ہجرت سے ہوئی۔

ربیع الاول کا مہینہ متوجہ کرتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ ہم اپنے پروردگار کے لئے اپنی محبوب چیزوں کو کتنا قربان کر سکتے ہیں اور اس کے راستہ میں ہم جاہ و مال کی چاہ سے اپنے کو کتنا بلند رکھ سکتے ہیں۔

ماہ ہجرت کے سلسلہ میں ایک طرف تو ہمارے لئے یہ مسرت کی بات ہے کہ ہجرت کو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ان کے اصحاب نے بطریق احسن انجام دیا اور اس اخلاص کے ساتھ قربانی دی کہ وہ رہتی دنیا تک کے لئے مثال بنی، ہم اس کامیاب عمل سے پوری طرح مسرور وخوش ہو سکتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ جذبہ جو اس عظیم عمل میں تھا در اصل اس کی تقلید ونقل کی ضرورت ہے، ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس جذبہ کے کتنے حصہ کو اپنی زندگی میں اتار سکتے ہیں۔

ربیع الاول کا مہینہ بڑا مبارک اور پر مسرت مہینہ ہے، اس میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور آپ نے اسی مہینہ میں ہجرت

فرمائی، لیکن یہ مسرت صحیح مسرت اسی وقت بنے گی جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وطریقہ کو اختیار کر کے اور ہجرت کے اندر پائے جانے والے قربانی اور نفس کشی کے جذبہ کو حسب استطاعت اپنانے کی کوشش کریں اور اپنی سیرت وزندگی کو اس کے زیراثر کرنے اور اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں، اس کے بغیر خطرہ ہے کہ یہ اظہار رونق ومسرت محض ظاہرداری بن کر نہ رہ جائے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی اور ارشاد کے مطابق نہیں ہوسکتی۔

ماہِ سعادت اور نبی رحمت ﷺ

ربیع الاول کا مہینہ خیالات اور مضامین کا ایک ہجوم لے کر آتا ہے جس کو نہ کوئی ان خیالات اور مضامین کا حق ادا کرنے کی خواہش رکھنے والا سمیٹ سکتا ہے اور نہ حق ادا کر سکتا ہے، زیادہ سے زیادہ اس خلاصہ کا ذکر کر سکتا ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں آیا ہے:

لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْم (۱۲۸) اور وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ" (۱۰۷)

پہلی آیت میں عربوں کو خطاب ہے کہ تم ہی میں نبی آیا ہے اور تم ہی میں کا ایک فرد ہے اور اس کو تمہارے دکھ و درد کی بے حد فکر اور احساس ہے، وہ تمہارا بے حد خیال کرنے والا ہے، اور ایمان لے آنے والوں کے لیے تو بہت ہی شفیق اور رحم دل ہے، اور دوسری آیت میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم کو ہم نے تمام جہانوں کے لیے رحم و کرم بنا کر بھیجا۔

دونوں آیتوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا یہ پہلو کہ "وہ سارے جہانوں کے لیے ایک کرم و رحمت ہیں" ظاہر ہوتا ہے، اور یہ محض آپ ﷺ کی مدح

نہیں ہے، بلکہ اس ارض وسماء کے خالق کا قول ہے جس سے حقیقتیں وابستہ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا کی کیا حالت تھی اور دنیا کدھر جارہی تھی اس کو تاریخ کے جائزہ سے بھی معلوم کیا جاسکتا ہے انسان نے خود کو بنی نوع انسان کے مختلف طبقات میں بانٹ رکھا تھا جس میں چند افراد جو طاقت اور وسائل زندگی کے سہارے بڑے بن جاتے تھے، اور دوسروں کو غلام ہی نہیں بلکہ غلاموں سے بدتر بنا لیتے تھے، ان سے صرف غلاموں کی طرح ہی کام نہیں لیتے تھے بلکہ ان کو اپنی تفریحات کے لیے بھی سفاکی اور ظلم کے ساتھ استعمال کرتے تھے، اپنے جشن اور دعوتوں کے موقعوں پر ان کو پھلجھڑی کی طرح جلا کر محفل کو سنوارا کرتے تھے، خونخوار جانوروں سے کشتی کراتے اور اس کے شکست کھا کر مرنے کی حالت کو بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھتے تھے اور یہ کام لوگوں کا مجمع جمع کر کے اسٹیڈیم میں ہوتا تھا، اور دوسری طرف سامان عیش وسلطنت رکھنے والے اپنے لیے ایسی نعمتیں اور لذتیں جمع کرنے کے عادی ہوتے کہ ان کے تصور سے آدمی حیران رہ جائے، بادشاہ کے تاج کی قیمت اور اس کے درباریوں کی پگڑیوں کی قیمتیں حیران کن ہوتی تھیں، اور ان کے بغیر وہ اپنے کو باعزت نہیں سمجھتے تھے، کھانے پکانے اور گانے بجانے والوں کی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی۔

عورت کو صرف عیش کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور اس کی خاطر اور عزت صرف اسی لحاظ سے ہوتی تھی اس کے علاوہ بھی اس کو مردوں کے مقابلہ میں پست اور نا پسندیدہ سمجھا جاتا تھا، وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بھائیوں کے مقابلے میں کمتر سمجھی جاتی، اس کو ماں باپ کے ساتھ بھائیوں کی بھی خدمت کرنا لازم ہوتا، ان کی طرح معزز درجہ نہیں دیا جاتا تھا، اور اس کا پیدا ہونا شگون بد اور ایک مصیبت سمجھا جاتا، شادی کے بعد اس کا تعلق اپنے ماں باپ کے گھر سے ختم ہو جاتا، میراث میں

بھی اس کو حصہ نہیں ملتا، وہ حق صرف بھائیوں کا ہوتا، شوہر کے مرجانے کے بعد اس کی مٹی اور بھی پلید ہوجاتی، میکہ سے تعلق تو ختم تھا۔ اب اپنے شوہر کے گھر میں محض خادمہ اور نوکرانی کی پوزیشن میں رہنا ہوتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ ﷺ نے غلاموں اور عورتوں دونوں کو ان کا انسانی حق دلایا، اور ان کو اسی طرح معزز اور حقدار انسان قرار دیا جس طرح انسانوں کے دوسرے طبقات ہیں، آپ ﷺ نے صاف اعلان فرمادیا کہ دیکھو تم سب ایک انسان آدم کی اولاد ہو، تم سب برابر ہو، گورے ہوں یا کالے، عرب ہوں یا غیر عرب، کوئی کسی سے بڑا چھوٹا نہیں، ہاں نیکی اور خداترسی کی بنیاد پر آدمی بڑا ہوسکتا ہے، پھر آپ ﷺ نے اس پر عمل کروایا اور خود بھی کیا اور دنیا کو دکھادیا کہ انسانوں کی آپس کی مساوات کیسے ہوتی ہے، ایران کے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، افریقہ کے بلال حبشی رضی اللہ عنہ، روم کے صہیب رومی رضی اللہ عنہ، کو اپنے ساتھ اس طرح رکھا کہ جیسے اپنے افراد خاندان کو رکھتے تھے، اپنے غلام زید رضی اللہ عنہ بن حارثہ کو آزاد کر کے اپنے بیٹے کی طرح رکھا، حتیٰ کہ لوگ ان کو آپ کا متبنیٰ کہنے لگے، پھر اپنی پھوپھی زاد بہن کو ان کی زوجیت میں دے کر دنیا کو حیران کردیا، عورت کے حقوق کو ادا کرنے کا سخت حکم دیا، ان کا حقِ میراث بھی رکھا، شادی ہوجانے کے بعد بھی اس کے ماں باپ کو اس کی فکر وخیال کا حکم دیا، اور شوہر کو اپنی بیوی کا اپنی سطح کے مطابق زندگی کے وسائل مہیا کرنے کا حکم دیا، اور نباہ نہ ہونے پر دونوں کی علاحدگی کا انتظام طے فرمایا، دولت کو اعتدال اور انصاف کے ساتھ خرچ کرنے کا حکم دیا، بخل سے بھی منع کیا، اور اسراف سے بھی روکا، دولتمندوں پر غریبوں کی مدد اور ہمدردی ضروری قرار دی بلکہ ان کی دولت میں ان کا حق مقرر کردیا، کسی کا مال ناحق لینے، کسی کی عزت کو نقصان پہنچانے، کسی کی جان کو بلاحق لینے کو حرام قرار دیا، حق تلفی یا بلاوجہ جان لینے پر انتقام

لینے اجازت دی، لیکن اس انتقام میں حق وانصاف سے تجاوز کرنے کو حرام قرار دیا۔
اوران باتوں کا صرف حکم ہی نہیں دیا بلکہ ان پر عمل کرنے والا پورا معاشرہ تیار کیا، اورانہی اصولوں پر عمل کرنے کی عادت ڈالی کہ آپ ﷺ کے ماننے والوں کی زندگیوں میں بھی ان پر پورا عمل کرنے کے عجیب عجیب نمونے سامنے آئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب جہاد کے لیے فوج بھیجی تو حکم دیا کہ دشمن کی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے والوں کو بالکل نہ چھیڑا جائے، کسی علاقہ پر فوج کشی صرف اس وقت کی جائے جب ان سے اسلامی اصولوں کے مطابق بات کرنے کے بعد معاہدہ ہونے سے مایوسی ہو جائے، اور جو علاقہ فتح ہو وہاں کے باشندوں کی کسی چیز کو بغیر اس کی قیمت ادا کیے ہوئے نہ لیا جائے اور کسی کو اپنے مذہب کے چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیت المقدس کے حکمراں نے وہاں کی حکومت سپرد کر دینے کے لیے بلایا تو آپ رضی اللہ عنہ جس سواری پر گئے اس پر ایک ہی آدمی بیٹھ سکتا تھا، آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کا غلام تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے اور اس کے درمیان باری تقسیم کرلی کہ کچھ دور آپ رضی اللہ عنہ بیٹھتے وہ پیدل چلتا، وہ بیٹھتا اور آپ رضی اللہ عنہ پیدل چلتے، اس طرح جب بیت المقدس کا شہر قریب آیا تو باری غلام کی تھی، غلام نے بہت چاہا کہ شہر میں داخل ہوتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ ہی سواری پر بیٹھیں، آپ رضی اللہ عنہ راضی نہیں ہوئے۔

ایرانی شہنشاہ کی جب شکست ہوئی اور اس کا ہیرے جواہرات کا تاج ایک مسلمان کے ہاتھ آیا، انہوں نے اپنے دامن میں چھپا کر لا کر اپنے امیر کے سپرد کر دیا، اور اپنا نام بھی نہیں بتایا کہ یہ کام میں نے اللہ کے لیے کیا ہے وہ میرا نام جانتا ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم وتربیت سے ایسا معاشرہ تیار کرایا جس

کا ایک ایک فرد آخرت کے ثواب کی فکر کرنے والا دنیا کی لذتوں سے بے رغبت تھا، حق پر جان دینے والا حق کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کرنے ولا، ہر معاملہ میں پورے انصاف کے ساتھ کام کرنے والا، بے گناہ اور کمزور کی رعایت کرنے والا، خواہ وہ غیر مسلم ہو، جانوروں تک پر رحم دلی کرنے والا تھا، حق کی تبلیغ اور اسلام کی نشر واشاعت میں ہمدردی اور رحمدلی کا رویّہ رکھنے والا، ماں باپ اعزہ پڑوسی اور جس کے جو حقوق اسلامی شریعت میں بتائے گئے ان کے حقوق ادا کرنے والا تھا۔

اس طرح دنیا نے اخلاق وانسانیت اور بھائی چارگی کی فضا کا ایک ایسا نمونہ دیکھا جس کی نظیر اس سے پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی اس سے قبل پوری انسانیت، ظلم اور ناانصافی اور لذت کوشی اور عزّت وذلت کے جھوٹے پیمانوں کے ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی کہ اس کے بعد انسانیت خود اپنے ہاتھوں سے خودکشی کر لیتی۔

دوسری طرف دنیا نے علم میں ایسی ترقی کر لی تھی کہ طاقت اور راحت وترقی کے وسائل ایسے حاصل کر لئے تھے کہ تمدن وتہذیب کی چمک دمک نگاہ کو خیرہ بناتی تھی ایک طرف ساسانی ایمپائر تھا دوسری طرف رومی ایمپائر تھا، اور دنیا ان کی طاقت وترقی کو دیکھ کر ششدر تھی لیکن انسانیت ظلم وحق تلفی سنگدلی اور لذت کوشی، اونچ نیچ کے ظالمانہ طور وطریق کے نیچے سِسک رہی تھی اور حکومت کرنے والوں، عیش ولذت کے متوالوں، علم وہنر کے ماہروں اور فلسفہ وحکمت اور مذہب کے پیشواؤں کو اس کا احساس نہ تھا، اور احساس تھا تو وہ اپنے کو اس کی تبدیلی سے عاجز محسوس کرتے تھے اور حالات کے ساتھ خود بھی بہ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانیت پر رحم آیا اور اس نے اس گندے اور ظالمانہ ماحول کو بدل دینے کے لیے نبی کا انتخاب کیا، اس کو مکمل شریعت، مکمل ضابطہ عمل دیا،، اس کو آخری نبی بنایا، اور اس کو وہ

شریعت دی جس میں دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور علم وہنر کے انتہائی ترقی کے آنے والے زمانوں میں زندگی کے تقاضوں کے ساتھ بھی یہ ہم آہنگ ہوسکے، اور انسانیت کے اختتام تک کام آسکے اور جس سے انسان کے بدلتے ہوئے حالات میں جو نئے تقاضے ابھریں ان کا بھی اس میں جواب ملتا رہے، اس طرح انسانیت کی زندگی کی سلامتی اور خیر کی کشتی قیامت تک آسودگی اور راحت کے ساتھ چل سکتی ہے اور وہ رحمت ونعمت وخیر وبرکت جو نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے دائمی اور ہمہ گیر طریقہ سے جاری ہے، اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ قائم ودائم ہے کہ ہم نے تم کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً۔

رسول اللہ ﷺ کی محبت وتابعداری کے اثرات

ملت اسلامیہ کا وجود اور اس کی اسلامیت کا استحکام جن خصوصیات سے وابستہ ہے ان میں سرفہرست دو خصوصیات ہیں، ایک خدائے واحد پر ایمان اور اسی کی بندگی، دوسری نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری اور آپ ﷺ کی محبت ہے، توحید کی خصوصیت تو مسلمانوں کو شرک کرنے والی قوموں اور افراد سے جدا کر کے ایک خدائے واحد کا پرستار اور اسی کے حکموں کا ماننے والا بناتی ہے، دوسری خصوصیت خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری اور یہ عقیدہ کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ کا لایا ہوا دین آخری اور مکمل دین ہے، یہ خصوصیت تمام مسلمانوں کو ایک مضبوط اور متحد قوم بنانے والی ہے، اور آپسی محبت وتعلق کا رشتہ قائم کرنے والی ہے، ملت اسلامیہ کی یہ دو خصوصیات نہ صرف یہ کہ اس کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہیں بلکہ ان کے ذریعہ مسلمانوں میں ایسا اتفاق واتحاد اور میل محبت پیدا کرتی ہیں جس کی نظیر دوسری قوموں میں نہیں ملتی، شرک والوں کے طریقے، عادتیں اور عمل، علاقوں علاقوں کے فرق سے علاحدہ علاحدہ ملیں گے، اس لئے کہ توحید کے عقیدہ کے علاوہ کوئی دوسری ایسی مؤثر طاقت نہیں ہے جو کسی قوم میں یکسانیت اور یکجہتی پیدا کرے اور خاتم المرسلین کے ختم رسالت و تکمیل دین پر عقیدہ اور ان کی محبت امت کے افراد میں جو اخوت اور بھائی چارہ پیدا

کرتی ہے اور عالم اسلام کے ہر ملک کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جس طرح جوڑ دیتی ہے اس طرح کوئی اور ذریعہ نہیں جوڑ پیدا کرسکتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں میں رنگ ونسل، زبان وثقافت، ملکی اور وطنی حالات کے ہر طرح کے فرق کے باوجود اخوت وتعلق کی ایسی فضا بن جاتی ہے کہ دوسروں کے لئے بڑی حیرت کا باعث بنتی ہے، لیکن مسلمانوں کی یہ دونوں بنیادی صفتیں ان کو مکمل سطح سے اس وقت حاصل ہوتی ہیں جب وہ توحید کے پختہ عقیدے کے ساتھ محبت واطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کاربند ہوں، محبت رسول ﷺ اس کا بڑا ذریعہ رہا ہے اور حدیث شریف میں اس کا بہ تاکید ذکر آیا ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مومن (حقیقی مسلمان) نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اتنا محبوب نہ ہو جاؤں جتنا نہ اس کے والد، نہ اس کا بیٹا اور نہ دنیا کا کوئی دوسرا شخص ہو" یعنی اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کی محبت اپنے باپ بیٹے اور ہر ایک انسان کی محبت سے زیادہ ہو، یہ ہے وہ درجہ جو حقیقی مسلمان کا بتایا گیا ہے۔

مسلمان کو جب اپنے رسول آخر الزماں ﷺ سے ایسی بڑی اور گہری محبت ہوتی ہے تو نہ تو اس کو آپ کے بتائے ہوئے عقیدے کے علاوہ کوئی دوسرا عقیدہ قبول ہوتا ہے اور نہ کوئی ایسا رسم ورواج یا عمل (جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہو یا ناپسند کیا ہو) اس کو قبول ہوتا ہے، اور جب اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعی سب سے زیادہ محبت ہوگی تو اس کا دین خالص اور اس کے اثرات اور اطاعت مکمل ہوگی، اور یہی وہ اثر وطاقت ہے جو زمانے کے ساتھ کم ہونے کے باوجود آج تک مسلمان کے دین کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے دیگر مذاہب خواہ آسمانی ہوں یا زمینی، سب زمانہ کے اثر سے اپنی اصلی حالت سے بہت دور ہو چکے ہیں لیکن اسلام آج بھی اپنی صحیح شکل میں باقی ہے، اس کی دینی شکل وہی ہے جو اس کے نبی

آخرالزماں ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل بتائی اور سکھائی تھی، اس میں اصل وجہ خدائے واحد پر ایمان اور عقیدۂ رسالت ہے جو اسلام کو اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتا اور اس میں ہماری دستگیری حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تابعداری کا تعلق و محبت اور ان کے اقوال و احکام پر عمل یا عمل کی خواہش کرتی ہے۔ ہم کو جب بھی کسی مذہبی معاملہ میں یا کسی دوسرے مذہب کو دیکھ کر کسی معاملہ میں اشتباہ ہوتا ہے یا قابل دریافت بات محسوس ہوتی ہے تو ہم خدائے واحد کی بھیجی ہوئی کتاب قرآن مجید کو جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، سب سے پہلے دیکھتے ہیں اور جو انہوں نے فرمایا اور بتایا اور خود کر کے دکھایا اور جو ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی طرف سے بتایا یا ان کی بات پیش کی اس کو دیکھتے ہیں اور وہاں سے جواب حاصل کرتے ہیں، بلکہ آپ ﷺ کی تابعداری کے جذبے سے اس کو لیتے اور عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس طریقے سے بھٹکنے سے بچ جاتے ہیں اور صراط مستقیم پر گامزن رہتے ہیں، لیکن یہ تابعداری اور صراط مستقیم کی یہ طلب اور دین حق کی یہ فکر اسی وقت پوری طرح کام کرتی ہے جب ہم کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور تابعداری کا تعلق ہو اور یہ احساس ہو کہ قیامت میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو دیکھیں گے تو دین حق کی فکر اور اتباع شریعت اور سنت نبویؐ پر عمل کے سلسلہ میں ہم نے دنیاوی زندگی میں کیا کیا اس کو دیکھ کر ہمارے رویہ اور طرز سے خوش ہو کر ہم کو اچھی نظروں سے دیکھیں گے یا ہماری بدعملی کو دیکھ کر منہ پھیر لیں گے اور کہیں گے کہ اے پروردگار یہ لوگ ہمارے نہیں ہیں، انہوں نے ہمارے طریقہ کو نہیں اختیار کیا تھا، ان کو دنیا کے دوسرے لوگوں اور چیزوں سے محبت زیادہ تھی، لیکن مسلمان کو جب واقعی اپنے نبی ﷺ سے محبت ہوگی تو وہ محبت اس کو اس کے نبی ﷺ کے حکم اور اس کی لائی ہوئی شریعت اور دین سے ہٹ کر کوئی کام کرنے میں آڑے آجائے گی اور توجہ دلائے گی

کہ اے محبِ رسول ﷺ تم قیامت کو، اپنے نبی ﷺ کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ اور تمہارے خدا کے حضور میں تمہارے نبی ﷺ تم کو کیا کہہ کر پیش کریں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والے کا یہ احساس اس کے درمیان اور خدا اور رسول ﷺ کی نافرمانی کے درمیان ایک پشتہ بن کر آ جاتا ہے جو اس کو غلط اور نافرمانی کے کام سے روک دیتا ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیتے رہا کریں کہ ہمارے تعلق کی مختلف پسندیدہ شخصیتوں اور ہماری زندگی کی مختلف پسندیدہ چیزوں سے ہماری محبت ہمارے حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق و محبت سے بڑھی ہوئی تو نہیں ہے، کہ وہ ہم کو اس طریقۂ زندگی سے ہٹا دے جو ہم کو ہمارے محبوب نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور قیامت کے روز ہم کو ان کے سامنے شرمندہ اور پروردگار عالم کے سامنے ہم کو مجرم بنا کر کھڑا کر دے۔

ہمارے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری محبت آخرت میں کامیابی دلانے کے ساتھ اس دنیاوی زندگی میں مسلمانوں کے درمیان بھی تعلق و محبت استوار کرنے والی ہے اور اس کا اثر پوری تاریخ میں ملتا ہے کہ اس کے اثر سے پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی کی فضا قائم ہوئی اور قائم ہے اس کے باوجود کالے گورے کے فرق کے اور رسول آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین و شریعت کو تسلیم کرنے والے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ محبت کا تعلق مسلمانوں کو آپس میں جوڑنے والی ایک زبردست طاقت ہے جو اس کو برائیوں اور گمراہیوں سے بچانے والا ایک بڑا ذریعہ بن جاتی ہے، یہ ایک عظیم نعمت ہے بلکہ ملتِ اسلامیہ کی متاعِ زندگی ہے، اس کی حفاظت کی برابر فکر کرنا لازمی ہے لیکن اس کے لئے حضور صلی اللہ

علیہ وسلم سے اپنا تعلق بڑھانا اور آپ ﷺ کی بتائی ہوئی زندگی کو اپنانے کی فکر کرنا ہوگا، آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ اور آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے حالات اور کیفیات کو جاننا ہوگا اور آپ ﷺ نے خدائے واحد پر ایمان لانے اور اس کے حکموں کو ماننے اور اسی کی بندگی کرنے کے لئے جو ہدایات دی ہیں ان پر کار بند ہونا ہوگا، اور آپ ﷺ نے اس کے لئے جو تکلیفیں اٹھائیں، مصیبتیں جھیلیں اور قربانیاں دیں ان کو دیکھنا ہوگا اور ان سے روشنی حاصل کرنا ہوگا، تاکہ ہم آخرت میں اپنی کامیابی اور سرخروئی کا سامان کرسکیں اور اپنے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قیامت (حساب وکتاب) کے دن آپ ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے پیش کرسکیں۔ ہر ماہِ ربیع الاول کی یہ تاریخیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کے لائے ہوئے طریقۂ زندگی کو اپنانے کی طلب پیدا کرتی ہیں، باقی رہے، کمزور نہ ہو، تم اس کو بھول نہ جاؤ اور اس کی صفت وخصوصیت کو باقی رکھنے سے غفلت نہ برتو، یہی پیغام ہم کو اللہ کی کتاب قرآن مجید سے ملتا ہے اور یہی پیغام سیرت کے جلسوں سے ملتا ہے اور یہی پیغام ہم کو سیرت کی کتابوں اور آپ ﷺ کی حدیثوں سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو جادۂ حق پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے، جس کا انحصار خدائے واحد کی بندگی اور اس کے آخری رسول ﷺ کی تابعداری اور اس کی محبت پر ہے۔

انسانیت کی عید

ربیع الاول کا مہینہ بہار کا مہینہ ہے، یہی وہ مہینہ ہے جس سے انسانیت کی بادِ بہاری چلی، اس کی آمد انسان کے شرف واعزاز اور انسانیت کے عز وافتخار کی یاد دلاتی ہے، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے انسانیت اپنا یہ عز وافتخار کھو چکی تھی، جسے بعثت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوبارہ بحال کیا، انسانیت کی گراوٹ کی تصویر کشی اس حدیث سے بخوبی ہوتی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر نظر ڈالی تو ان کو ناپسند کیا، عرب کو بھی عجم کو بھی سوائے اہل کتاب میں سے کچھ بچے کھچے لوگوں کے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا انسانیت پر فضل وکرم ہے کہ جب انسانیت فساد اور بگاڑ کی آخری حد کو پہنچ گئی تھی، اور عز وشرف سے بہت دور جا چکی تھی، اور انسانیت پستی وادبار کی تہہ میں جانوروں کی سی زندگی گزار رہا تھا، اور وہ ایسا درندہ بن چکا تھا کہ وہ دبے کچے انسانوں کے ساتھ وہ معاملہ کرتا تھا جو بڑے جانور چھوٹے جانوروں کے ساتھ کرتے ہیں اپنے مفاد کے حصول کے لئے دوسروں کو قربان کر دیتا، کام لیتے وقت بیل کی طرح جوتتا لیکن مزدوری نہ دیتا، اگر دیتا بھی تو بہت معمولی جو نہ کے برابر ہوتی، ذرا سی ناراضگی پر ریگستان وصحرا کی نذر کر دیتا، مخالفوں کو جنگلوں میں

جانوروں کی غذا بننے کے لئے بھیج دیتا، انسان کا انسان کے ساتھ سلوک اس سے سخت اور ناقابل بیان ہو چلا تھا جو ایک سنگدل انسان بے زبان جانوروں کے ساتھ کرتا ہے، اس سے زیادہ سنگدلی اور بے رحمی کی بات اور کیا ہوگی کی ملوک وامراء جو خود کو اعلیٰ درجہ کا انسان سمجھتے تھے قیدیوں میں جنہیں وہ سزائے موت کا مستحق سمجھتے اپنی اعلیٰ دعوتوں اور کھانے کی محفلوں میں بلاتے اور انہیں آگ کا الاؤ بنا کر اپنے معزز مہمانوں کی ضیافت کرتے کہ اس کی روشنی میں وہ کھانا تناول کریں، ان کے نزدیک ان کی تکلیف اور اس کے جل کر راکھ ہونے سے مہمان کی ضیافت دوبالا ہو جاتی تھی، اور ایک اچھا سامان تفریح ہو جاتا تھا۔

عورت کی حقیقت کھلونے کی سی اور آلات طرب وعیش کی تھی، بے چوں وچرا خدمت لی جاتی اس کو خوب استعمال کیا جاتا، حیا وعفت اور آبرو کا کوئی لحاظ دونوں جانب نہ تھا، اور یہ سب کچھ اس وقت تھا جب وہ زندہ درگور ہونے سے بچ جاتی۔

حصول مال وزر میں ہر وہ طریقہ اختیار کرنا صحیح سمجھا جاتا تھا جس سے مال میں نمو ہو، خوشی ناخوشی کی کوئی پرواہ نہ کی جاتی تھی، سود، رشوت، غصب، ڈاکہ ڈالنا، چوری، خیانت جس کے بس میں جو ہوتا وہ کرتا۔

دینی ومذہبی حالت نہایت ابتر تھی، اوہام وتصورات اور خرافات میں لوگ زندگی گزار رہے تھے، غلط سلط عقیدے گڑھ رکھے تھے، سورج چاند، ستاروں، حجر وشجر، دریا، جانور حتی کہ کیڑے مکوڑوں کی عبادت کرتے تھے، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ نفع رساں اور ضرر رساں ہیں اس کے لئے ان کے ضرر پہنچنے سے بچنے کے لئے ان کی عبادت ضروری ہے آسمانی مذاہب کے ماننے والے بھی جادۂ حق سے ہٹ گئے تھے، نصاریٰ نے ایک معبود برحق کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اس کے اختیار وقدرت کو بانٹ دیا تھا، کہ الٰہ واحد کو تسلیم کرنے کے لئے روح القدس اور بیٹے کو بھی

جوڑنا ضروری سمجھا، اور یہود نے اپنی نسل کے بعض نبیوں کو الوہیت کا درجہ دے کر اپنے کو اللہ کی اولاد قرار دے دیا، اور کہا "نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاءُ هٗ" اور اپنے کو عام انسانوں سے بالاتر طبقہ قرار دے کر دوسرے تمام انسانوں کو جانوروں کی جگہ رکھا، اور ان کے دل ودماغ میں یہ بات رچ بس گئی تھی کہ ہماری موجودگی میں کسی دوسرے کی عزت وناموس کوئی چیز نہیں ہے اور کسی دوسرے کو دنیا سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔

ان حالات میں خاتم الرسل سیدنا محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی بعثت ہوئی آپ ﷺ نے ان غلط عقائد وخیالات کی پُرزور نفی کی اور بہیمانہ ووحشیانہ زندگی کی زبردست مخالفت کی اور ظلم وفساد کو ختم کیا، اور انسان کو اس کی پستی سے اٹھایا، ندائے حق بلند کی، اور پھر اس کے نفاذ کے لئے کھڑے ہوئے، کچھ نے شروع ہی میں ساتھ دیا، کچھ شدید مخالفت پر آمادہ ہوئے، اور انھوں نے آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے جانثار اصحابؓ پر جان لیوا مظالم کئے، لیکن آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے اصحابؓ نے یہ سب کچھ اللہ کے راستے میں سہا، جمے اور ڈٹے رہے، دعوت وتبلیغ کرتے رہے، کہ حق سر بلند ہو اور باطل سرنگوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بگاڑ اور فساد کو ختم کرنے، اور ضلالت وانحراف کو دور کرنے کے لئے جہد مسلسل سے کام لیا اور انسان کو بتایا کہ وہ اپنے رب کی کس طرح بندگی کرے اور اپنے ماں باپ کے ساتھ کس طرح سلوک کرے، پڑوسیوں کے ساتھ کیسے رہے، رشتے داروں اور دوستوں، تعلق والوں کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرے، چھوٹوں اور ماتحتوں کے ساتھ کس رحم دلی اور شفقت ومحبت سے پیش آئے، بڑوں اور اپنے ذمہ داروں کا کیسا لحاظ وخیال کرے، اور یہ تعلیم دی کہ بنی نوع انسان میں کوئی کسی سے برتر نہیں ہے سارے انسان برابر ہیں، سب آدمی ہیں، اور آدم مٹی

سے بنے ہیں، عرب ہوں یا عجم نہ عربی کی عجمی پر نہ عجمی کی عربی پر کوئی فضیلت و ترجیح ہے، اور نہ گوروں کی کالوں پر اور نہ کالوں کی گوروں پر، ہاں اگر ہے تو صرف تقویٰ (وطہارت) کی بنیاد پر ہے، اور یہ بتایا کہ وہ اشرف المخلوقات ہے لیکن دوسری مخلوق کے ساتھ بھی اس کا معاملہ شفقت ونرمی کا اور نفع رسانی کا ہونا چاہئے، "ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء" (ابوداؤد) آپ ﷺ کالازوال ارشاد وتعلیم ہے، اور یہ کہ "الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (طبرانی) ساری مخلوق اللہ کے زیر پرورش ہے اللہ کی مخلوقات میں اللہ کو سب سے پسندیدہ وہ ہے جس کا رویہ اس کے زیر پرورش مخلوق کے ساتھ اچھا ہو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہد مسلسل وسعی پیہم تقریباً نصف صدی جاری رہی یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ایک ایسا مثالی انسانی معاشرہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ جیسا روئے زمین پر کبھی نہیں دیکھا گیا تھا، اس معاشرہ کا ہر فرد عقیدہ وعمل میں اپنی مثال آپ تھا، یہ ممتاز انسانی معاشرہ صلاح وہدایت کا حامل معاشرہ تھا، اس معاشرہ کے افراد انسانی فضائل کے داعی وناشر تھے اور ہر معاشرہ کو اخلاقی زوال سے صاف کر دینے کی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو اس کے مرتبۂ عالی پر دوبارہ فائز کیا، اس کو اس کے عز وشرف کی چوٹی پر پہنچایا، امن وسلامتی کی ڈگر پر کھڑا کیا، صفائی وپاکیزگی عطا کی، سیرت وسلوک اور اخلاق وصفات میں جمال وکمال سے آراستہ کیا، اور اس طرح کیا کہ زبان خلق کہہ اٹھی کہ انسانیت کی صبح صادق طلوع ہوئی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری رواں دواں قافلۂ انسانیت کے لئے منارۂ نورینی کہ جس کی روشنی میں انسانی قافلہ چلتا رہے گا، اور آپ ﷺ کی بعثت

سے انسانیت کو نشأۃ ثانیہ ملی اور پھر آپ ﷺ کی ختم نبوت نے اس کو بقاء ودَوام بخشا، ماہ ربیع (بہار) میں آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی، اور یہی ہجرت کا مہینہ بھی ہے کہ جس کے بعد اعلیٰ ترین انسانی اقدار کے مطابق مثالی معاشرہ تشکیل پایا، اور پھر اسی ماہ مبارک میں آپ ﷺ نے اپنا کام مکمل فرما کر وفات پائی، اور مثالی انسانی معاشرہ کی تشکیل کی تکمیل ہوئی، اس طرح یہ مہینہ اپنے ساتھ ایک پیغام رکھتا ہے، اس ماہ بہار (شهر الربيع) نے پوری دنیا میں انسانیت کی بادِ بہاری چلائی، ہر سال یہ ہمارے سامنے بادِ بہاری کے جھونکے لے کر آتا ہے، اور ہمارے سامنے کچھ تقاضے اور ذمہ داریاں رکھتا ہے، عربی شاعر نے بہت خوب کہا ہے۔

ولد الهدى فالكائنات ضياء

وفم الزمان تبسم وثناء

''ہدایت کا آفتاب طلوع ہوا اور اپنی ضیا پاش کرنوں سے وجودِ کائنات کو منور کیا اور زمانے کی زبان خوشی اور حمد وثنا کے نغمے گانے لگی۔''

وصلى الله على خير خلقه وخاتم رسله محمد ن المصطفى وعلى اله وصحبه أجمعين (١)

---

(۱) ترجمہ از عربی محمود حسن حسنی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ

عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی

اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی

اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝